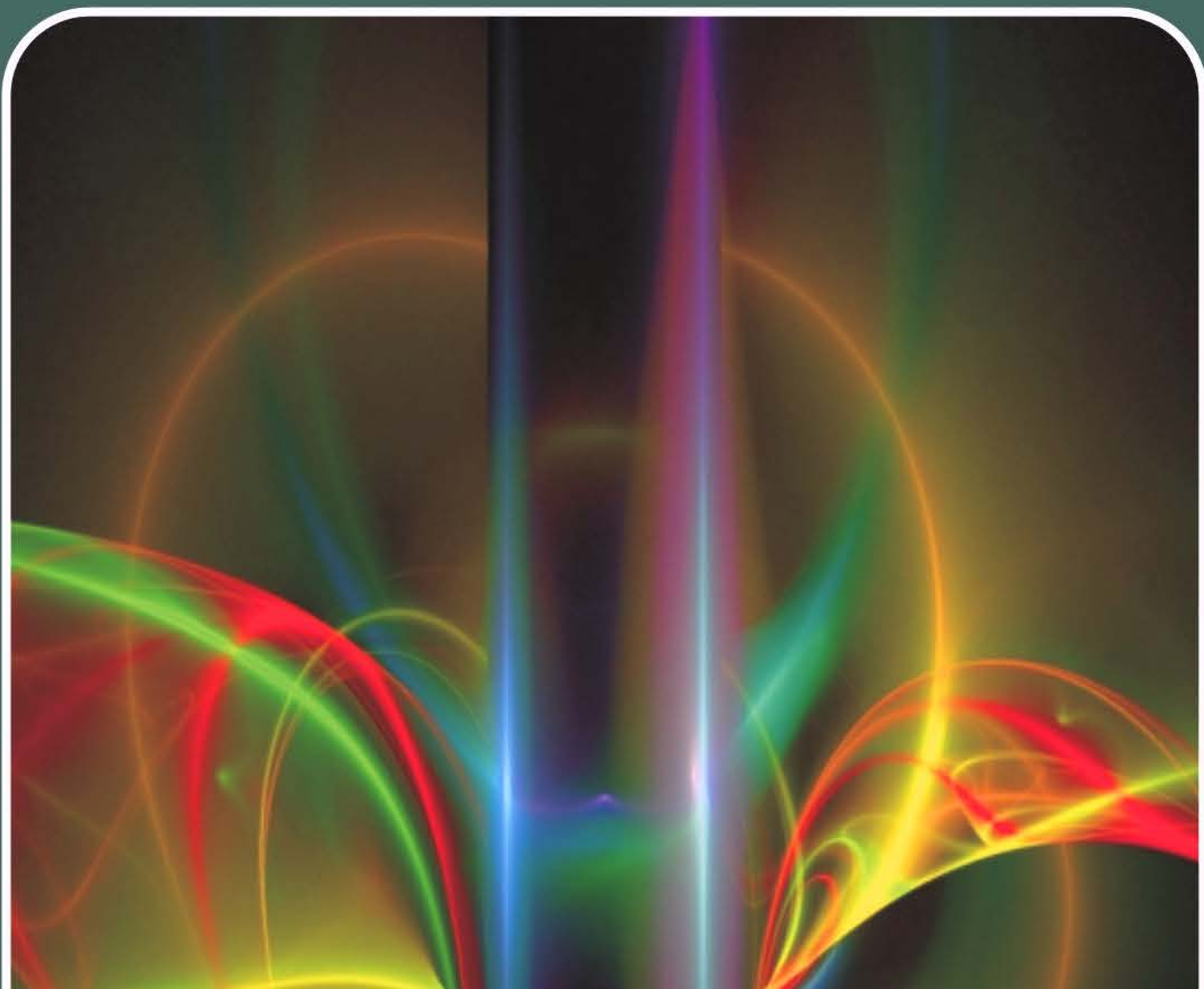
تحسین و آفرین

تاثراتی اور تنقیدی مضامین



محمد بشیر رانجھا

زُہیر کنجاہی کی ہشت پہلو غزلیہ شاعری

غزل فرد کی شخصیت کے اظہار کا ایک ایسا وسیلہ ہے جس میں اجتماعی سماجی فکر کی عکاسی ہوتی ہے۔غزل کے اس پس منظر میں اگر زُہیر کنجاہی کی غزل پرکھا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ زُہیر کو اپنی غزل میں انسان کے فکری اور سماجی مسائل سمونے پر قدرت حاصل ہے۔ زُہیر گہرے فنی شعور کا مالک ہے اور فنی شعور کی اسی خداداد صلاحیت کے بل بوتے پر وہ شعوری اور لاشعوری طور پر اپنی شاعری میں انسانی فکر اور اس کے سماجی مسائل کو اجاگر کرتا ہے۔

اب کون انہیں بتائے تعاقب میں ہے خزاں
لوگ مطمئن ہیں بہاروں کو دیکھ کر

ملے کہاں سے وفا کا کوئی چھلکتا جام
تمام لوگ ہیں سوکھے سمندروں کی طرح

ہے جن کے دم سے دُنیا اِک جہنم
چلے ہیں اب وہ تسخیرِ قمر کو

آدمیت کا اُسے کیا اِدراک
آدمی کو جو فرشتہ جانے

آدمیت سے نہیں ہے دُور کا بھی واسطہ
کون سے سانچوں میں یارب! آدمی ڈھلتا رہا

ان اشعار کی قرأت سے یہ حقیقت کھلتی ہے کہ زُہیر حقیقی معنوں میں انسانی زندگی کا شاعر ہے جس نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں دلچسپی لی اور زندگی کا مختلف زاویوں سے انتہائی قریبی مشاہدہ و مطالعہ کیا ہے۔اس کی کوشش رہی ہے کہ زندگی کے راز کی تہ تک پہنچ کر زندگی کی بعض اہم حقیقتوں کا سراغ لگایا جائے۔ زُہیر محسوسات کی شاہراہ پر گامزن نظر آتا ہے۔ حیات کے

ساتھ اس کی دلچسپی ذہنی، فکری، محسوساتی اور عملی سطح پر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی امر کے اظہار سے پہلے اس کے عملی مشاہدے، تجزیے اور تجربے کے بعد حیات انسانی پر اس کے اثرات کو مدِنظر رکھتے ہوئے پورے فنی شعور کے ساتھ شاعری میں استعمال کرتا ہے۔ ژہیر کی غزل میں سب سے نمایاں بات حیات اور اس کے بانکپن کی واضح جھلک کا موجود ہونا ہے۔ تنوع، رنگا رنگی، وسعت اور ہمہ گیری کی تمام خصوصیات اس کے شعروں میں بیک وقت جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ ژہیر کے مندرجہ ذیل اشعار حیاتی شاعری کی ایک عمدہ مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں جن کا اثر براہِ راست انسانی حواس پر ہوتا ہے اور ان میں حسن کا احساس اور احساس کا حسن دونوں نمایاں طور پر اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔

نادان ہیں جو بازوئے ہمت کو توڑ کر
کشتی کو ناخدا کے بھروسے پہ چھوڑ دیں

ہر کوئی اس کو تماشا جانے
زندگی کیا ہے کوئی کیا جانے

کاکل و رخسار کی توصیف ہی لکھتے رہے
زندگی کے چاند سورج اس لئے گہنا گئے

کوئی بھی چہرہ گردِ الم سے تہی نہیں
کوئی بھی دِل نظر نہیں آتا ہے بے ہراس

یہ سادگی ہے دِل کی یا وقت کا کرشمہ
مظلوم ظالموں سے انصاف مانگتا ہے

لے کر چلا ہوں میں نئے امکاں کی مشعلیں
آتے ہیں وسوسے بھی دلِ بدگمان میں

ژہیر کی غزل عہدِ جدید کے مسائل اور نئی نسل کے متنوع مشاہدات پر تجربات کی حقیقی

آئینہ داری کرتی ہے اسی لئے اس میں نیا لہجہ اور مزاج ملتا ہے۔ اس کی شاعری میں نہ صرف مضامین کی جدت اور اُپج نظر آتی ہے بلکہ فنی لحاظ سے بھی اس میں ایک اچھوتے پن کا احساس ملتا ہے۔ اس کی غزل کا اسلوب روایتی ہو کر بھی مخصوص لفظیات کے استعمال کی بدولت ایک نئے آہنگ کا محرک بنا ہے۔ نئی علامات اور اشارات کے استعمال سے اس کی غزل ایک نئی فضا سے آشنا نظر آتی ہے۔ زُہیر نے نئی نسل کی مخصوص ذہنی اور جذباتی کیفیات کے اظہار کے لئے ان گنت نئے پیکر تراشے ہیں جس کے ثبوت میں زُہیر کے مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اشارہ اس کو مل جاتا جو تیرے چشم و ابرو کا
تو اعزاز ہلالِ آسماں کچھ اور بڑھ جاتا

آ گئی زُلفیں بکھیرے جس گھڑی وہ جانِ من
اُس نے میرے صبر کی بنیاد تھی جو، توڑ دی

ہم سفینے کے لئے اِک بوجھ ہیں
ہم اگر ڈوبے تو بیڑا پار ہے

وہ سر کو سرتاج بنانے کا جب سوچا کرتی تھی
میں پنچھی آزاد فضا کے سپنے بُنتا رہتا تھا

زُہیر کی اکثر غزلیں عشقیہ کیفیات وواردات کی آئینہ دار نظر آتی ہیں لیکن ان وارداتوں اور کیفیات کے اظہار کی نوعیت بالکل جدا ہے۔ ان میں ایک منفرد رنگ اور آہنگ نظر آتا ہے۔ اس کے اشعار میں ایک نیا احساس، نیا جذبہ اور ایک نیا شعور بھی نظر آتا ہے اور ان سب نے مل کر اس کے اشعار کو نئی نسل کے دِل سے نکلتی ہوئی آواز کی عملی صورت بنا دیا ہے۔ جس میں خود اعتمادی ہے عشق کی اہمیت کا احساس ہے، بیباکی اور قطعیت ہے۔ یہ آواز مجروح ضرور ہے لیکن اس میں خودی اور خودداری ہے، خود پرستی، خود اعتمادی اور خود شناسی کی ایک ایسی رو بھی ہے جو نئی نسل کے مزاج کی نمایاں خوبی کے طور پر جانی جاتی ہے۔ زُہیر کی عشقیہ شاعری میں محبوب اور اس کے حسن کا

ایک نمایاں پرتو نظر آتا ہے۔ وہ محبوب کی اہمیت سے چشم پوشی نہیں کرتا اور اس کی خودداری محبوب کے حسن کو نظر انداز بھی نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ ڑہیر کی غزل میں محبوب کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ ڑہیر نے مختلف زاویوں سے محبوب کی اہمیت واضح کی ہے۔ ڑہیر حسن کی تعریف بھی کرتا ہے اور محبوب کی سیرت کا نقش بھی کھینچتا ہے لیکن ایک نئے اور منفرد انداز سے:

میں نے خلوصِ قلب سے چاہا ہے آپ کو
ہاں مجھ کو اعتراف ہے اپنے قصور کا

اک تم کہ تم کو حرفِ وفا تک یاد نہیں
اک میں کہ تم کو جانِ وفا جانتا ہوں میں

ہماری نظر حسن کی رازداں ہے
کوئی ان کو دیکھے ہماری نظر سے

اردو غزل کی روایت میں سراپا نگاری اور محبوب کی تصویر کشی ایک نیا اور اچھوتا انداز رکھتا ہے۔ جس میں شاعر کے نئے احساس اور نئے شعور کا عکس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ڑہیر کی غزل میں مشاہدے سے زیادہ محسوسات کا رنگ بہت گہرا اور کسی حد تک زیادہ شدت کے ساتھ ملتا ہے جس نے اس کے اندر ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہے۔ ڑہیر کی غزل میں خارجیت پسندی کا ہی عمل دخل نہیں بلکہ شدید حسیاتی کیفیات اور داخلیت پسندی کا اثر بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ ڑہیر صرف دیکھتا یا مشاہدہ ہی نہیں کرتا بلکہ محسوس بھی کرتا ہے اور اس کے یہی محسوسات اسے ایک نئی منزل پہ پہنچا دیتے ہیں جہاں داخلیت اور خارجیت دونوں باہم دگر مل جاتی ہیں۔ ڑہیر کا مزاج نئی نسل کا مزاج ہے اسی لئے اس کی غزل میں یہ خصوصیات جلوہ گری دکھاتی ہیں۔

اُسے جس نے دیکھا تو یہ کہا کہ وہ خوبرو، وہ ہے خوب خُو
اُسی خوبُرو کے جمال سے مری شخصیت میں نکھار ہے

وہ مجھ کو چاند جیسا لگ رہا تھا

میں اُس کی روشنی میں جب کھڑا تھا
اس کے ہونٹوں کی سُرخیوں سے زُہیرؔ
رنگ بھرتے ہیں بات بات میں ہم

زُہیر کی شاعری کا تعلق سماجی اقدار اور اجتماعی انسانی رویّوں سے ہے۔ وہ سماج دشمن عناصر اور منفی اقدار پر شدید تنقید کرتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس رونما ہونے والے حالات و واقعات کا گہرا اثر قبول کرتا ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں کو اپنی شاعری میں نمایاں طور پر پیش کرنا اس کی غزل کا ایک اہم رجحان ہے۔ زُہیر کی شاعری کو ہشت پہلو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ ان تفصیلات کو پیش کرتے ہوئے زُہیر کا زاویہ نظر تمام تر خارجی ہی نہیں رہتا، وہ اس سلسلے میں صرف اپنے مشاہدات ہی نہیں پیش کرتا بلکہ اس کی نظر داخلی پہلوؤں پر بھی مرکوز رہتی ہے۔ زُہیر کی شاعری صرف عصری میلانات کی ترجمان ہی نہیں بلکہ اس کے میلانی دریا کے پاٹ بے حد وسیع ہیں جن میں بے حد وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ وہ زندگی کے تنوع اور رنگا رنگی کا شاعر ہے۔ اس نے زندگی کے انہی متنوع پہلوؤں کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔

وہ آستیں میں چھپائے ہوئے تھا اک خنجر
بصد خلوص، بصد لطف جو بھی دوست ملا
سورج عروج پا کے ہُوا مائلِ اُفق
یوں بھی نہ خاتمہ ہو کسی کے غرور کا

زمانے کے حالات و واقعات اور زندگی کے عصری میلانات کی ترجمانی اس کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ علاوہ ازیں از زندگی سے منسلک بے شمار دیگر مسائل و معاملات کو بھی اس نے اپنی غزل میں پیش کیا ہے۔ مثلاً ناسازگار ماحول اور زوال پذیر انسانی اقدار کے ایک غلط نظام میں زندگی جن حالات سے دوچار رہتی ہے ان پر تفصیل کے ساتھ زُہیر نے اپنی غزل میں جرح و تعدیل کی ہے۔ اس نظام نے زندگی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ گئے لمحوں کی

تلخیوں کو سامنے رکھ کر بڑی بے جگری سے کہتا ہے۔

میرے ہر ذرّے سے اُبھرے کی صدائے زندگی
میں بکھر کر کارواں در کارواں ہو جاؤں گا

ہم نے وقارِ عشق نہ گرنے دیا زُہیر
گو مٹ کے خاک ہوگئے پر التجا نہ کی

جبر کو سہتے ہوئے مدت ہوئی
حیف ہے اب وقت کے مختار پہ

کیا جانیئے آفت ہے کہ آسیب ہے کوئی
ہر شخص وطن کا تو پریشاں سا لگے ہے

زُہیر کی شاعری نہ ہی کسی تجریدی آرٹ کا تمثیلی مرقع ہے اور نہ ہی مابعد الطبیعیاتی گورکھ دھندے کا کوئی پیچیدہ زائچہ ہے بلکہ اس میں دردمندی کی ایک ہلکی سی لہر اور انسانی جذبوں سے جنم لیتے نظریہ حیات کا پرتو نظر آتا ہے۔ زُہیر کی شاعری میں فرد کے نفسیاتی اور معاشی مسائل ایک دوسرے میں گڈمڈ نظر نہیں آتے۔ زُہیر انسان کو تجریدی شکل میں پیش نہیں کرتا بلکہ فرد کی سماجی حیثیت، معاشی حالت اور تہذیبی بلندی و پستی کے نقوش کو نمایاں کر کے اصل موضوع کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہی وہ خصوصیت اور انفرادیت ہے جو اسے ہر طبقہ فکر کا شاعر بناتی ہے۔ زُہیر فکر و فلسفہ کی بھول بھلیوں میں داخل ہو کر حقیقت اور حقیقی دُنیا کو بھولتا نہیں بلکہ انسان کے نفسیاتی مسائل کا حل گہرے فکری و فنی شعور کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

اسلحہ کی گھن گرج مٹ جائے گی
ناز کیسا اس بڑے انبار پہ

عزت کے ساتھ میں بھی رہوں گا، تھی یہ اُمنگ

لیکن وطن میں رہ کے بھی تنہا رہا ہوں میں

نگری نگری گھوم رہے ہیں انسانوں کے غول

ڈال سے ٹوٹ کے تیز ہوا میں جیسے بکھریں پات

زُہیرؔ ان رہبروں سے بچ کے رہنا

یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

”صورتِ اظہار“ اور زُہیر کنجاہی

”صورتِ اظہار“ پروفیسر زُہیر کنجاہی کا مجموعہ کلام ہے جو ”عروسِ جمیل“ کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ آج کل شعراءاور ادیبوں کی ایک خاصی تعداد اس قدر خوشحال ہو چکی ہے کہ اس کے لئے کسی کتاب کو ”لباسِ حریر“ سے آراستہ کرنا مشکل نہیں رہا۔ بسا اوقات حریری لباس کے اندر ”عروسِ جمیل“ کا سراغ نہیں ملتا اور ان کی کتابوں میں کتابت اور طباعت کا سارا حسن تو موجود ہوتا ہے مگر حسنِ کلام ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا لیکن زُہیر کی کتاب ”صورتِ اظہار“......عروسِ جمیل اور حسنِ کلام ......دونوں خوبیوں سے آراستہ ہے۔

پاکستان میں ایسے شاعروں کی بھی کمی نہیں جو اپنی دو چار غزلوں کے بل بوتے پر پاکستان کے باہر کی دُنیا میں پاکستان کے ”ممتاز شعراء“ کہلاتے ہیں حالانکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خود پاکستان میں انہیں ”شاعر“ کہتے ہوئے خاصا محتاط ہونا پڑتا ہے۔ زُہیر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ زُہیر کنجاہی کی خوش نصیبی کا ایک پہلو یہ بھی رہا ہے کہ انہیں اپنی کتاب کو آب وتاب کے ساتھ منظرِ عام پر لانے میں خود کوئی محنت نہیں کرنا پڑی یہ دردِ سر ”عارف فرہاد“ کے حصے میں آیا۔

غزل میں زُہیر کنجاہی کا رُجحان جدیدیت کے پہلو بہ پہلو کلاسیکیت کی طرف رہا ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے نے مجھے ایسی خوشگوار حیرت سے آشنا کیا جو میرے گردوپیش کو کسی طلسم کی طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اس کے بعد ان کی شاعری کے اسرار مجھ پر خود بخود وا ہونے لگتے ہیں۔

ریت اڑتی ہے اب کناروں پر
چڑھ کے دریا اتر گیا ہو گا

اَب ملا اِک مرشدِ کامل مجھے
اَب ملا مجھ کو مرا اپنا پتا

جو لفظ اُس کے ہجر میں لکھے وہ بول اٹھے
میرے قلم نے یہ ہی مجھے سیم و زر دیا

دوسرے اہم شعرا کی طرح ان کے ہاں ایک سطح پر جمالیاتی تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے اور وہ ہنر مندی نظر آتی ہے جو صرف اور صرف اُن لوگوں کا مقدر ٹھہرتی ہے جو اپنی وجودی سچائیوں کے ساتھ ہمہ وقت اپنے حجرۂ حرف وہنر میں مصروف ریاض رہتے ہیں۔ وہ مشاہدات، احساسات اور جذبات سے شعر کے خدوخال یوں نکھارتا ہے کہ اُس کا قاری اُس کی نظر کی گہرائی اور گیرائی میں کھو نہیں جاتا بلکہ اس کی غزل کے طلسماتی آہنگ سے بھی سحر زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں معنی کے دریا اتار دینے کے ہنر سے واقف ہے۔

اِک وہ کہ شاد کام تھا ساقی کے فیض سے
اِک میں کہ ایک بوند نہ میرے سبو میں تھی

رسوا ہے شہر شہر میں اب تُو بھی میرے ساتھ
کچھ تیری آبرو بھی مری آبرو میں تھی

بام پر یہ کون آیا بے نقاب
ظلمتِ شب میں بھی تابانی ہوئی

زُہیر کی غزل معصوم دِل اور بے داغ ذہن کی فنکارانہ دسترس کی مثال پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے غزل کے مخصوص پیرائیوں کو خلوص قلب ونظر سے برتا ہے۔ ان کے شعر میں جذبے کی شدت اور حدت اس طرح موجود ہے جس طرح کسی اچھے غزل گو کے پاس ہونی چاہیے۔ ان کے اشعار میں غزل کا وہ آہنگ ہے جس پر خوبصورت تراکیب، تشبیہات اور استعارات کو بے دریغ قربان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ گویا رنگیں بیانی کے سارے طلسم ان کی سادہ بیانی کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں مضامین کی کمی نہیں۔ اُن کی نگاہ معاشرتی اقدار کی پامالی اور انسانی مسائل پر رہتی ہے۔ اور وہ ان سے نوع نوع کے مفاہیم اور مطالب اخذ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری زمین سے پیوستہ

ہے مگر آفاقیت سے بھی مملو ہے۔ وہ اپنے نواح کی طلسماتی فضاؤں، سمن زاروں، گنگناتی آبشاروں، رنگ بدلتے موسموں اور ندیوں کی آہستہ خرام لہروں کو اپنے رگ و پے میں بسائے ہوئے ہے۔ اس لئے اُن کی شاعری رس بھری اور جادو بھری ہے۔

پلکوں پہ جگمگاتی ہے جو شمعِ آرزو
دولت یہی ہے پیار کی، رکھنا سنبھال کر
بازارِ محبت کی طرف اب تو نکل آ
بھٹکیں گے یہاں تیرے خریدار کہاں
مجھ جیسا کوئی تیرا خریدار نہیں
اور ہے تو مری جاں وہ طلبگار کہاں تک

انہوں نے روایت کی لذت اور عصریت کی رنگارنگی سے اپنے اشعار کے قالب تیار کئے ہیں اور پھر ان میں نوع نوع کے مضامین اور خیالات اس سلیقے سے بھر دیئے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر اُن کی قادر الکلامی کے جوہر کھلتے ہیں۔ وہ اپنے اسلوب و بیان میں دوسرے شعراء سے منفرد اور الگ نظر آتے ہیں یہی اُن کے فن کا کمال ہے۔

ہر اک شاخ پہ لٹکے ہیں سر بریدہ پھول
یہ کس گناہ کی پاداش میں ہوئے مصلوب

زُہیر کے پاس بے سروسامان زادِ سفر اور بے پر و بال اڑان کے ایسے مشاہدے اور تجربات ہیں کہ وہ شعری تجسیمات میں گھر کرتا کامیوں اور کامیابیوں کی نادر تصویر دکھاتا نظر آتا ہے۔ زُہیر کے پاس عمدہ اشعار کا ایک ذخیرہ موجود ہے جو اُن کی روح سے اٹھ کر زبان سے پھسل دیتا ہے اور جب اُن کا سامع اُن کے اشعار سنتا ہے تو اُن میں زُہیر کا پورا سراپا جلوہ گر نظر آتا ہے۔

وہ سادہ اور سہل زبان میں شعر کہتے ہیں۔ بعض اوقات تو بڑی بات بھی اُن کے شعر کے قالب میں ڈھل کر اتنی آسان ہو جاتی ہے کہ قاری اُن کی فنکارانہ مہارت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ

سکتا۔ زُہیر بے ریا محبت اور پیچیدہ انسانی صورت حال کے بیان میں بطور خاص مہارت رکھتے ہیں ۔ ان کے اظہار میں سلاست اور شگفتگی کا ایسا وفور ہے جو انسانی جذبات کا منفرد انداز میں احاطہ کرتا ہے۔ اُن کی شاعری میں خواب اور شکست خواب سے گریز کا ایک ایسا آمیزہ ملتا ہے جو انہیں لائق توجہ ہم عصری حسیت کا عکاس بنا دیتا ہے اور یہ بذات خود ایک قابل تحسین خوبی ہے۔

جب گل کھلے تو مجھ کو تری یاد آ گئی
بادِ صبا بھی سانس تمہارا لگا مجھے
میرے اشکوں سے نہ جانے انہیں نفرت کیوں ہے
گل تو شبنم کو اٹھا لیتے ہیں اکرام کے ساتھ
دوستی بن چکی ہے بازیچہ
ایک اٹھاتا ہے اک گراتا ہے

زُہیر کی غزل میں درد و غم بھی ہے اس درد و غم میں رجائیت کی صورتیں بھی موجود ہیں ۔ وہ غزل میں شیرینیاں گھولنے کے ہنر سے بھی واقف ہے اور جدت پسند رجحانات سے بھی اپنی غزل کو سنوارنے کے رموز سے بھی کماحقہٗ آگاہ ہے۔ زُہیر کے اشعار میں معاشرتی اور اخلاقی اقدار کی پامالی پر گریہ وزاری بھی بدرجۂ غائیت موجود ہے۔ وہ ایک سچا، کھرا اور ہمدرد انسان ہے۔ جو اپنی سماجی اور تہذیبی قدروں کی دیوار کو ریزہ ریزہ ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ ان کی شاعری کا سیاسی، سماجی اور معاشی سیاق و سباق بتاتا ہے کہ وہ مابعد جدیدیت کے دور کے احساسات رقم کر رہے ہیں ۔ وہ روح عصر کے ساتھ پوری طرح شیر و شکر ہے۔ اُس کی غزلیں داخلی کیفیات کی ترجمان اور اسی داخلیت کے ایسے خارجی پیکر ہیں جن میں غمِ روزگار اور غمِ جاناں کا فرق معدوم ہو جاتا ہے۔

صحراؤں میں حسیں بگولوں کے بھیس میں
بھٹکی ہوئی ہے راستہ محمل کی آرزو
جس کی اڑان میں نہ ملے وسعتِ فضا

اس طائرِ خیال کو بے بال و پر کہو

ژہیر غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں بڑے کامران نظر آتے ہیں۔ وہ نہ تو الفاظ کے گورکھ دھندے تیار کرتے ہیں اور نہ ہی جدت طرازی کے زعم میں اپنے اسلوب بیان کو پیچیدہ کرنے کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزل روایت سے ہم آہنگ ہو کر بھی سامع اور قاری کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ ژہیر کی اکثر غزلیں چھوٹی بحر میں ہیں۔ یہ بڑا دشوار رستہ ہے مگر وہ اپنی طبیعت کی جولانی اور قادر الکلامی کی بناء پر نہایت آسان اور بڑے مؤثر انداز سے یہ مسافت طے کر جاتے ہیں۔ ان کی غزل کا سارا حسن ان چھوٹی بحور میں کہی گئی غزلوں میں در آیا ہے۔

ان میں الجھا ہی چلا جاتا ہے دل
اپنی زلفوں کو ذرا سلجھائیے

جو لڑ سکتا ہے گرداب بلا سے
اُسی کے ساتھ چلتے ہیں کنارے

ہر جانب ہیں درد کے پہرے
چار طرف ہیں کالی بلائیں

ژہیر کی پہچان دو حوالوں سے ہوتی ہے۔ ایک تو شعر گوئی ہے اور دوسرا اور اہم حوالہ اُن کی ذات میں متحرک ایک ایسا انسان جو شرافت سے رنگ آمیز، محبت اور دردمندی سے لبریز ہے۔ شعر کی تخلیق میں اُن کی ذات کے وصف جب نمایاں ہونے لگتے ہیں تو اُن کی سادہ سی غزل میں بھی محبتوں کی شدت اور دردمندی کی حدت دکھائی دینے لگتی ہے۔ وہ دردمندی کے اس مسلک سے کبھی انحراف نہیں کرتے۔ ژہیر کے اخلاص کی کوئی حد نہیں ہے مگر اُن کا خاندانی پس منظر اور ذاتی شرافت ان کی حمیت اور خودداری کو ہمیشہ زندہ رکھتی ہے۔ وہ محبت اور پیار کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے مگر اپنی انا اور خودداری کا سودا بھی نہیں کر سکتے۔ ژہیر کی انسان دوستی اور دوسروں کے لئے مضطرب رہنا جا بجا اُن کے اشعار میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

زُہَیر کنجاہی کی ماہیا نگاری

اپنے انداز……اپنی سج دھج اور لہجے کی برجستگی کے لحاظ سے زہیر کنجاہی پہلی ملاقات میں ایک سٹھیایا ہوا بابا نظر آتا ہے۔ جیسے اُسے بے تکان بولنے اور سامع سے اپنی بات منوانے کا جنون ہے۔ میں بذاتِ خود اسے ایسا ہی سمجھا۔ وہ جب بات کرتا ہے تو بلا تکلف ''یار'' کہہ دے گا چاہے سامنے والا اس کا جانی دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اس کا تکیۂ کلام ہے یا اس کے اندر کے انسان کی معصومیت……میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ قلم و قرطاس سے تقریباً چھ دہائیوں سے کھیلنے والا یہ نوجوان بزرگ اردو، پنجابی ہر دو زبانوں میں شاعری، افسانہ نویسی، تنقید، ترجمہ، تحقیق، انشائیہ اور مزاح نگاری بڑی روانی، سلاست، آسانی اور مستقل مزاجی سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس کی شخصیت کے اتنے پرت ہیں کہ ہر ملاقات پہ ایک نیا انکشاف ہوگا۔ اس کی موٹر سائیکل اتنی اسپیڈ سے نہیں چلتی ہوگی جتنا اس کا قلم چلتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہر دوست کے ساتھ مقدور بھر برابری کے تقاضوں کے عین مطابق دوڑتا چلا آرہا ہے۔ ایک انتہائی اہم بات اس بندے کی یہ ہے کہ وہ منافقت کر ہی نہیں سکتا۔ شاید اس نے اس فن کی جانب توجہ نہیں دی یا اس میں مہارت حاصل نہیں کر سکا۔ سچی اور کھری بات تو ویسے ہی چھُری ہوتی ہے۔ جسے وہ دوست اور دشمن دونوں پر یکساں مہارت سے چلاتا ہے۔ اسے آپ کی بات ناگوار گزری ہے تو ناک کو سنے کی بجائے فوراً سچ کا ہتھوڑا لے کر عین وقت پر اور برسرِ مجلس ضرب لگانے سے نہیں چوکتا۔

بابوں جیسی عمر میں نوجوانوں جیسی چستی اور چالاکی سے پیش آنے والا یہ بزرگ بچہ مجھے پہلی ملاقات میں قطعی اچھا نہ لگا۔ لیکن اسے کیا کہئے کہ پہلی ملاقات میں ہی وہ میرے ساتھ ایک چال چل گیا۔ شاکر کنڈان کے ساتھ مجھے گھر ملنے آیا اور پوری طرح اپنی باتوں کے سحر میں لینے کے بعد غائب ہو گیا۔ بس دوسری ملاقات کی تشنگی دے کر چلا گیا۔ کافی عرصہ بعد دوبارہ ملاقات

ہوئی تو میں نے اسے لوٹ لیا۔ یوں سلسلہ چل نکلا جو تا حال جاری وساری ہے۔جس زہیر کنجاہی کو میں پاک و ہند کے معتبر اخبارات اور رسائل میں تواتر سے پڑھ رہا تھا یا اس سے قطعی مختلف نکلا۔ میں نے اس کا جو خاکہ اپنے ذہن میں تراش رکھا تھا وہ میرا منہ چڑانے لگا۔لہٰذا میں نے کچھ اور محنت اور توجہ سے اس کا مطالعہ ومشاہدہ کرنا شروع کر دیا۔

اس کی کتاب ''ساون کے مہینے میں'' چھپ کر آئی تو مجھے بھی ملی۔ یہ ایک نیا انکشاف تھا۔''زہیر کنجاہی نے ''ماہیا'' بھی لکھنا شروع کر دیا''...... نام نہاد نقادوں کو ''ساون کے مہینے میں'' بھی ''باڑ'' جیسا......اُبال آیا......مخالفین نے ادبی تنقید کے بجائے'' دَبی دُبی سُن قیدُ'' اور خاصی حد تک ''غیر ادبی تنقید'' کے تیر چلانا شروع کر دیئے۔کوئی ماہیے کے اوزان کا ترازو لے کر بیٹھ گیا تو کسی نے زبان و بیان کا ڈول ڈالا۔ایک صاحب نے اپنے تنقیدی مضمون میں ''دانستہ'' طور پر جو ماہیے quote کئے انھیں توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ مجھے ایسے نام نہاد دانشوروں سے صرف ایک گزارش کرنا ہے کہ......آسان سی بات ہے جس شہر میں جانا نہ ہو اس کا راستہ نہیں پوچھنا چاہئے۔اگر زہیر کنجاہی پسند نہیں تو سیدھا سادا طریقہ تو یہ ہے کہ اُسے اپنے حال میں مست رہنے دو اور اگر اس سے کوئی علمی فروگزاشت ہو گئی ہے تو اسے خالص علمی اور تحقیقی اصولوں کے مطابق پرکھو،تا کہ کچھ مزہ بھی آئے۔ادب میں سوقیانہ پن کی تو رَتی بھر بھی گنجائش نہیں ......البتہ اختلاف رائے کی گنجائش ضرور رہتی ہے۔ایک بندے نے کچھ تخلیق کیا ہے تو تخلیق کو پرکھا جائے نہ کہ بندے کا شجرہ نسب لے کر بیٹھ جائیں اور اس کی ذات کا پوسٹ مارٹم شروع کر دیں۔تخلیق کے فنی حسن وقبح پر بحث کرنا تو مسلم ٹھہرا لیکن یہ کہاں کی تک ہے کہ اردو ناول کا نام ''پریشر ککر'' تو قبول ہے اور ماہیے میں ''مسول'' برداشت نہیں۔''بحث طول پکڑ جائے گی اور یہ اس وقت میرا موضوع بھی نہیں......بات زہیر کنجاہی اور ''ساون کے مہینے'' کی کرتے ہیں۔

یہ بات تو ہر قاری کے علم میں ہے کہ ''ماہیا'' پنجابی کی ایک صنفِ سخن ''لوک گیت'' کو کہا جاتا ہے۔جس کے متعلق انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۷، صفحہ ۴۶۷ پر ایک مقالہ نگار لکھتا

ہے’’......لوک گیت کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ اسے معاشرہ یعنی گاؤں، قوم یا قبیلہ (خاندان) قبول کرے۔اوراس کا یہ رجحان ہے کہ یہ جب ایک فرد سے دوسرے کو منتقل ہوتا ہے یا کسی دوسرے کے سامنے گایا جاتا ہے تو اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے......‘‘۔ماہیا بھی لوک گیت کی ایک معروف صنف ہے۔اوراب یہ گانے کے بجائے پڑھنے کی چیز بن گئی ہے۔اس کے موضوعات میں بہت وسعت آ گئی ہے۔ پیارومحبت ،ہجروو صال کے علاوہ اس میں زندگی کے عام مسائل،مشاہدات اور تجربات مثلاً فلسفہ و منطق، حمد و نعت، مذہب اور عقیدہ،معاشرہ ، معیشت......سب کچھ سما گیا ہے۔اب اگر زہیر کنجاہی یہ کہتا ہے کہ:

(۱) ہے عرض دعاؤں میں / سانس میں لوں جا کر / کعبے کی فضاؤں میں

(۲) یہ کام کروں مولا / جا کے مدینے میں / اک نعت پڑھوں مولا

(۳) اسلام کا دَم بھر لیں / جینا ہے تو آ / بغداد کا رُخ کر لیں

تو اسے لامحالہ یہ بھی کہنا پڑا ہے:

(۱) بھارت کی کہانی ہے / ایٹم بم سستے / آٹے کی گرانی ہے

(۲) کشمیر چلو یارو / ایک ہی حسرت ہے / ہندو کو وہاں مارو

(۳) کشمیر کو جانا ہے / پاک وطن والا / جھنڈا لہرانا ہے

ماہیا کو اردو میں اس کے ٹھیک ٹھاک ساتھ اپنانا ہی اس کی اصل خوبصورتی ہے۔زہیر نے اس صنفِ سخن میں بڑی سلاست روی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔اور یہ ہماری قومی زبان کے حق میں نیک فال ہے۔انہوں نے محض پنجابی چوکھٹے پر رنگ نہیں چڑھایا بلکہ اپنے اسلاف کی روایت کو بھی نبھایا ہے۔اورانہیں اس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

کسی اچھے نگر کے تھے / فانی، جگر، حسرت / استادحضر کے تھے

ماہیا کی ہئیت خواہ جو بھی ہو اس کی ماہیت پر بات کرنا بہت ضروری ہے۔آیا اس میں ہلکے پھلکے جذبات کا اظہار ہوسکتا ہے یا اس کے دامن میں ان پھولوں کے ساتھ سماجی،نظریاتی،

معلوماتی ''پتیوں'' کی باس بھی شامل کی جاسکتی ہے یا نہیں ۔ماہیے کا اصل حسن اس میں ملائمیت کا ہے۔نرماہٹ کا ہے۔ کچھ ایمائیت بھی سہی .....مگر تکلف کا مصنوعی لہجہ اسے گوارا نہیں .....اگر دل کی بات کے بجائے قلب و ذہن اور فلسفہ و منطق کی بات شامل کرنا ہے تو ایسے کہ ساعت مجروح نہ ہو۔زہیر نے اس بات کا خاص التزام رکھا ہے۔زہیر کے ماہیوں میں محض روایت پسندی کا اظہار ہی نہیں ملتا بلکہ ترقی پسندی کا بھی بھرپور انداز میں مظاہرہ کیا گیا ہے۔اس ماہیے کو اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے تناظر میں دیکھیں:

آنے وہ زمانے ہیں/الجھے ترے گیسو/میں نے سلجھانے ہیں

یا پھر یہ حسابی سوال دیکھیں:

دو اور دو چار کرو/شامل ایک کرو/پھر پانچ شمار کرو

زہیر کنجاہی نے ماہیے کو اردو زبان کا لباس پہناتے وقت اسے جذباتی حدود سے نکال کر بہت سی فکری جہتیں عطا کی ہیں۔انہوں نے ماہیے کو حمد و نعت .....مذہب و سیاست .....عہد حاضر کے مسائل اور لطیف جذبات و احساسات جیسے متنوع مضامین کا مرقع بنا کر پیش کیا ہے۔علاوہ ازیں ان کے ماہیوں میں کرب کی ایک زیریں لہر ملتی ہے۔اس کی بے انداز حساس طبیعت غم و آلام کی آگ میں تپ کر درد و کرب کی اُس کیفیت کو پہنچ گئی ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔حالانکہ ان کے درد میں نہ دوپہر کی شدت ہے اور نہ ڈھلتی شام کا اعتدال.....بلکہ کرب کا یہ اظہار زہیر کے عمیق مشاہدے اور اس کے بیحد تلخ تجربات کا نتیجہ ہے۔

راہ محبت بہت دشوار ہے۔لیکن جو اس وادی کے دامن میں اترا وہ ایسی منزل پر پہنچ گیا جہاں رنج و مسرت،غم و مسرت،خزاں و بہار کا امتیاز مٹ گیا .....اس کا رنج راحت بن گیا .....اور غم مسرت میں ڈھل گئے۔''ساون کے مہینے میں'' بھی ہر طرف پھول ہی پھول کھلے ہیں اور اس موسم میں زہیر ہر ایک کو یکساں توجہ اور ایک جیسے جذبات کے ساتھ خوش آمدید کہتا ہے۔

(۱) روٹھے کو منانا ہے/جب تک زندہ ہیں/اب ساتھ نبھانا ہے

(۲) نفرت نہیں بھر جانا / قول بزرگوں کا / اک روز ہے مر جانا

(۳) ابا کی صداؤں میں / سب کچھ ہوتا ہے / اماں کی دعاؤں میں

(۴) ہم قلم لگائیں گے / پیار کے بوٹے سے / باغات بڑھائیں گے

......

☆...... زبیر کنجاہی کے مجموعے "ساون کے مہینے میں" پر تاثرات (مطبوعہ: ماہنامہ "نیرنگِ خیال" راولپنڈی - سالنامہ ۲۰۰۶ء شمارہ ۱۰، جلد ۸۳)

زُہیر کنجاہی کی پنجابی نعت

محمد صادق چغتائی (قلمی نام زُہیر کنجاہی) مورخہ ۱۲ جون ۱۹۳۳ء کو ضلع گجرات کے معروف قصبے کنجاہ میں جناب اللہ دتہ چغتائی کے ہاں پیدا ہوئے جن کا شمار اپنے علاقے کے روساء میں ہوتا تھا۔ ابتدائی تعلیمی مدارج ڈی بی لوئر مڈل سکول سارو کی چیمہ ضلع گجرات اور ایم بی ہائی سکول چوہڑ کانہ منڈی (فاروق آباد) ضلع شیخوپورہ میں زیرِ تعلیم رہ کر پاس کئے۔ آٹھویں جماعت میں اسلامیہ ہائی سکول کنجاہ میں داخلہ لیا اور اسلامیہ ہائی سکول کنجاہ میں ہیڈ ماسٹر شیخ احسان الحق سلیمانی، میاں شریف کنجاہی، ضیاء احمد ضیاء، احمد حسین احمد قلعداری اور یوسف کمال ہستیوں سے کسبِ فیض حاصل کیا۔ انہی صاحبان کی تربیت میں محمد صادق چغتائی سے زُہیر کنجاہی بنے۔ ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ بعدازاں تدریس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ایف اے، بی اے، منشی فاضل اور ادیب فاضل، سی ٹی اور بی ایڈ کے امتحانات پرائیویٹ حیثیت میں پاس کئے۔ علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل (اردو) کیا۔ مختلف تعلیمی اداروں میں بطور مدرس، ہیڈ مدرس، لیکچرار اور وائس پرنسپل کے عہدوں پر فائز رہے۔

نویں جماعت سے شعر کہنا شروع کیا۔ مختصر کہانیاں لکھیں۔ پہلا افسانہ ماہنامہ ''نیرنگِ خیال'' میں ''جگنو'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں سید اقتدر موہانی سے بذریعہ خط وکتابت اصلاح لینا شروع کی۔ ۱۹۷۱ء تک ان سے اصلاح لیتے رہے اور ان کی وفات کے بعد سید یزدانی جالندھری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اور یہ سلسلہ ان کی وفات (۲۳ مارچ ۱۹۹۰ء) تک جاری رہا۔ پہلی نظم ماہنامہ ''محفل'' کے جنوری ۱۹۷۲ء کے شمارے میں ''ماتمِ یک شہر آرزو'' کے عنوان سے چھپی (۱)۔ ناول نویسی بھی کی دو ناول ''عرفان محل'' اور ''ارادت'' کے نام سے شائع ہو چکے

ہیں۔نظم ونثر کی چودہ کتابیں منظرِ عام پر چکی ہیں جن میں ایک اردو مجموعہ نعت ''مہرِ حرا'' بھی شامل ہے۔اردو پنجابی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے اور دونوں زبانوں میں نظم ونثر لکھتے ہیں۔ زُہیر کنجاہی نعت لکھنے والوں میں ایک معتبر حوالہ ہے۔ان کی نعت میں اسلوب کی تازگی، خیالات کی روانی، معنی آفرینی اور خیال آفرینی ایک نمایاں وصف ہے۔ان کی نعتوں میں لفظیات کا انتخاب انتہائی احتیاط سے کیا گیا ہے اور ندرتِ فن، خیال آفرینی، جذبے کی سچائی اور عشقِ رسول ﷺ میں والہانہ پن ان کی نعت میں نمایاں ہے۔ایک اردو نعت کے دو شعر دیکھیں:۔

بنایا ہے میں نے مدینے کو منزل
یہ منظر ہے آنکھوں کے پانی میں رکھا
کبھی لوٹ کر میں نہ آؤں گا گھر میں
یہی کام ہے کارِ ثانی میں رکھا

ماہنامہ مہکاں، لہراں، سانجھاں، لکھاری، سویر، ادب دوست، تخلیق، کے علاوہ متعدد ملکی وغیر ملکی رسائل میں ان کا پنجابی کلام تواتر سے شائع ہوتا ہے۔ فی الحال پنجابی نعت کا باقاعدہ مجموعہ شائع نہیں ہوا لیکن پنجابی نعت میں ان کے کلام کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نعت کا ضخیم ترین انتخاب کیا جا سکتا ہے۔اب زُہیر کنجاہی کی مختلف پنجابی نعتوں سے چیدہ چیدہ اشعار دیکھیں:۔

ڈِٹھا جد قرآن دے اندر تیری چھپ نوں لوکاں نیں
پچھے رہ گیا ہر اِک سوہنا اتر، پچھم، دَکھن دا
جاگے بھاگ ابو ایوبؓ انصاری دے اِک پل اندر
بڑیاں لوکاں چارا کیتا تیرےؐ دَر نوں کبھن دا
جالی روضے دی چُمّن لئی
منہ نوں پاک کرایا مولاؐ

خیر منگاں میں مُلک دی خاطر
کر دے اوس تے سایا مولاؐ
لوکی منگن دولت پیسے
تُسی مرا سرمایا مولاؐ

قدر محمدؐ سوہنے دی مینوں وی کرنی آئی
اپنے دِل دے اندر میں تاں ایہو نام وسایا
بچہ اِک یتیم خدا نیں فاراں ول گھلیا
پَل وچ گھور ہنیرے اندر نُور ای نُور سمایا
اوہ کالی کملی والا اے، کُل دُنیا دا رکھوالا اے
دو عالم اُس دی سرداری، دوعالم دا شہ بالا اے
اُس نُوری مُکھڑے تے، لولاک لما دا ہالہ اے
کیوں ڈرئیے کفر دے زہراں توں، اوہدے ہتھ وچ شہد پیالہ اے

اب ایک مکمل نعت دیکھیں:۔

اوہ پاک نبیؐ اے صل علیٰ، اوہدی ذات سبھاں توں اُچی اے
اوہدی اکھ دے موتی چن سورج، اوہدے دِل دی دولت سُچی اے
مشہور وی اے، محمود وی اے، وچ حشر دے والی سبھ دا اے
اوہ رحمت اے دو عالم دی، محبوب اوہ سوہنے ربّ دا اے
اوہ کُفر مٹاون آیا سی، اوہنے دین دا بُوٹا لایا سی
اوہنے وحدت مان ودھایا سی، نالے کثرت کوٹھا ڈھایا سی
جنہے نبیؐ دا روضا ویکھیا اے، اوہنے ربّ دی عظمت ویکھی اے
جنہے شہر مدینہ تکیا اے، اوہنے اکھیں جنت ویکھی اے

اِک نُور دا چانن ہسدا اے، پیا گھر مومن دا وسدا اے
ثقلین ہنیریاں راتاں وچ، بُھل گیاں نوں راہ پیا دسدا اے
سردار اے کُل پیغمبراں دا، اوہ فخر اے کُل جہاناں دا
سُت زمیاں دی رُشنائی اے اور نُور اے سَت اسماناں دا
جَہنے ناں محمدؐ جپیا اے اوہنوں تھوڑ زُہیر نہ کوئی اے
اوہدے نال اے رونق دو جگ دی اوہدے باجھ کدھرے ڈھوئی اے

(۲)

......

۱۔ سہ ماہی "گفتگو" لوک سُنجی پاکستان، جولائی - ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۵-۶

۲۔ مکتوب بنام مرتب مؤرخہ ۱۲ مئی ۲۰۰۷ء

زہیر کنجاہی کی پنجابی غزل (ایک مطالعہ)

اَج دا ویلا اَج دی گل اے، گھڑی گھڑی دا میلا پَل اے
پَل میلے وچ کون کسے دا، بھانویں سَکا بھائی ہووے

زُہیر کنجاہی کا سب سے بڑا حوالہ سرزمین کنجاہ اوراس سرزمین کے سربرآوردہ اور قلیم ادب کا وہ قبیلہ ہے جس نے اردو اور پنجابی ادب کی تمام اصناف پر انمٹ اور گہرے نقوش مرتب کئے ۔ان جگ مگ اور جھلمل کرتے ستاروں کی روشنی میں زُہیر نے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا تو اس کے سامنے کنجاہ کے احباب قلم کی وہ مضبوط روایت بھی موجود تھی کہ دورانِ سفر مشکلات اور صعوبتوں سے گھبرا کر منزل پانے سے پہلے بھاگ جانے والے راستے کی دھول ہو جاتے ہیں۔ اس مضبوط روایت پر عمل کرتے ہوئے زہیر نے فنی سفر کو اتنی محنت، ریاضت اور مشقت کے ساتھ نبھایا کہ آج وہ ایک بوڑھے برگد کی طرح اپنے بازو پھیلائے ہر ایک کو اپنی آغوش میں لینے کی صلاحیت سے مالا مال نظر آتا ہے۔غزل،نظم،افسانہ،ناول،تحقیق،تنقید کون سی صنفِ ادب ہے جو زہیر کی تخلیقی سلطنت سے باہر ہے۔

زہیر کی پنجابی غزل بھی زندگی کے نت نئے مسائل اور نئی نسل کے متنوع مشاہدات کے تجربات کی صحیح آئینہ داری اور اور بھر پور عکاسی کرتی ہے۔اسی لئے اس میں ایک نیا لہجہ اور نیا مزاج ملتا ہے۔اس کی غزل میں مضامین کی جدت اور اپچ نظر آتی ہے بلکہ فنی حوالے سے بھی اس میں ایک اچھوتے پن کا احساس ملتا ہے۔ان کی غزل کا اسلوب روایتی نہیں کیونکہ مخصوص لفظیات کے ذریعے انہوں نے اپنی غزل میں ایک نیا آہنگ اور فضا تخلیق کی ہے۔نئی علامات اور اشارات کے ذریعے انہوں نے نئی نسل کی مخصوص ذہنی اور جذباتی کیفیت کے اظہار کے لئے بے شمار نئے پیکر تراشے ہیں۔زہیر کی غزل کی امیجری بالکل نئی اور اچھوتی ہے۔احساس کی شدت اور تخیل کی جولانی نے ان کی تشبیہات اور استعاروں کو کچھ ایسا رنگ دیا ہے کہ جس میں سے زندگی اپنے

پورے بانکپن اور باطنی حسن کے ساتھ نکھر کر سامنے آ گئی ہے۔ ان کی شاعری میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں کیونکہ یہ شاعری ایک سادہ اور پرخلوص انسان کے دل کی آواز ہے اور اس شاعری میں خلوص اور صداقت کی فراوانی ہے۔ سادی اور صفائی اس شاعری کی جان ہے۔ ان تمام خوبیوں اور خاصیتوں کا پرتو ان کے اس مخصوص اسلوب میں بھی واضح طور پر نظر آتا ہے جو ان کی غزلوں کی اساس ہے۔ برجستگی، شگفتگی، شادابی، توازن، ہم آہنگی، تسلسل، تازی اور سادگی و پرکاری ان کے اسلوب کی نمایاں صفات ہیں۔ ویسے تو ان کے ہر شعر میں ان کے اسی اسلوب کی خصوصیات کی فراوانی ہے لیکن ان اشعار میں یہ اپنے بھرپور فنی حسن کے ساتھ نمایاں نظر آتا ہے۔

زہیر کی غزل میں زندگی اور عام انسانی رویوں کا احساس بڑی شدت کے ساتھ اور شدید طور پر سامنے آتا ہے اور یہ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ وابستگی کا اظہار بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ کرتے ہیں۔ زُہیر کی غزل میں بعض ایسی باتوں کا تذکرہ ملتا ہے جن کی سرخوشی نے انہیں اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ بلاشبہ عشق غزل کا بنیادی موضوع اور محرک ہے۔ اور ہمارے شعرا اس جذبے کی الگ الگ روپ میں جلوہ گری دکھاتے ہیں۔ زُہیر کی غزلوں میں بھی یہ جذبہ بڑی شدومد کے ساتھ جلوہ گر ہے لیکن اس کی نوعیت اور انداز ایک منفرد روپ میں نظر آتا ہے۔

عشق دا تپ جد چڑھ جاندا اے فیر ایہ کدی نہیں لہندا
گھر دا گھر دا گھر جاندا اے بھانویں زُہیر کنجا ہی ہووے
عشق دی اگ پئی لاٹاں مارے عقل دا وَس نہ چلے
دُنیا سڑ کے دوزخ ہوئی ٹھنڈ نہ پائی پیار
عشق دے دُکھ توں ودھ کے سجنو اِک روٹی دا روگ
جنہوں دووِیں دُکھ مِل جاندے پُچھو نہ اوس دا حال

زندگی میں خارجی اور داخلی، انفرادی اور اجتماعی طور پر جو واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں

اوران کے زیر اثر جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان کا اثر لامحالہ افراد کے قلب و ذہن پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ان اثرات سے جو بھی کیفیات زُہیر کی داخلی وخارجی اورانفرادی شخصیت پر مرتب ہوتے ہیں وہ انہیں تفصیلاً اپنی غزل میں پیش کرتا جاتا ہے۔ زُہیر نے غزل میں زندگی کی جن مختلف جہتوں کی تفصیلات پیش کی ہیں ان کی نوعیت تمام تر جذباتی نہیں بلکہ ان کا تعلق انسانی زندگی کے بنیادی حقائق سے ہے۔اوراس میں شبہ نہیں کہ جن معاملات اور کیفیات کوانہوں نے پیش کیا ہےان میں سے بعض تو زندگی کے اہم اور بنیادی حقائق ہیں۔ان کی غزل میں زیریں طور پر عشق کے متوازی زندگی کے اہم سماجی اور معاشرتی رویوں پر ردِعمل کی ایک روبھی بڑی شدومد کے ساتھ روبہ عمل نظر آتی ہے۔انہوں نے زندگی کی تلخیوں کے ساتھ ساتھ زمانے کی بے مہری کے غم کے احساس کو اتنے شدید کرب کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ خالص رومانی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بھی ان کی طرف اشارہ کرجاتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انداز ان کے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔

عشق دے دُکھ توں ودھ کے سجنو اِک روٹی دا روگ

جنہوں دوویں دُکھ مل جاندے پُچھو نہ اوس دا حال

سرگم کا متلاشی......سید مقبول حسین

میں نے دوستوں کی ایک محفل میں کہا تھا کہ ''تپش'' اور ''دل خاموش سوالی سا ئیں'' کو سامنے رکھ کر اگر کرنل مقبول حسین کے فکر و فن کے ارتقائی سفر کو دیکھا جائے تو یہ بات بڑی واضح اور صاف نظر آتی ہے کہ یہ بندہ بتدریج آگے کی جانب بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر اس نے حوصلہ نہ ہار دیا تو ایک دن وہ نئے امکانات اور بھرپور ڈکشن کے ساتھ میدانِ ادب میں اترے گا''۔ میری یہ بات آج اس وقت بالکل سچ ثابت ہو گئی جب کرنل مقبول ''سرِ ساحل'' جیسی خوبصورت اور جاندار قسم کی کتاب لے کر میدان ادب میں اترا ہے۔ اس میں انتہائی خوبصورت اور powerful شاعری پڑھنے کو ملتی ہے۔ یہ ان کا خالص غزل پر مشتمل مجموعہ کلام ہے۔

غزل روزِ اول سے ہی شاعری کی دیگر اصناف سے برتر اور ہر دلعزیز رہی ہے۔ دیگر اصناف سخن کی مقبولیت اور پذیرائی سے انکار ممکن نہیں تاہم غزل آج بھی روزِ اول کی طرح مقبول ہے۔ غزل میں زندگی سی تازگی اور حرارت ہے۔ اس میں بات کہنے کا اپنا ہی نشہ اور رنگ ہوتا ہے۔ تمام اصناف سخن کی سرداری اسی کو زیبا ہے۔ غزل میں نزاکتِ احساس، پرکاری اور صوتی و معنوی حسن نہ ہو تو وہ محض قافیہ بندی ہی کہلائے گی۔ محض ظاہری صناعی بھی تخلیق شعر میں حسن پیدا کرنے کا موجب نہیں بن سکتی۔ جب تک شاعر وارداتِ قلبی کے بیان کا گہرا شعور نہ رکھتا ہو اس وقت تک وہ اچھا شعر نہیں کہہ سکتا۔ احساسات کی رفعت، تجربے کی گہرائی اور تاثر کی شدت ہی شعر کو خوبصورت اور حسین بنا سکتی ہے۔ الفاظ جتنے سادہ، سیدھے، عام فہم اور روزمرہ کی زبان سے لئے جائیں معنوی خوبی کی موجودگی میں اتنے ہی دلکش اور بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ لفظوں کی آرائش اور مشکل الفاظ کے استعمال سے دامن شعر میں جدت پسندی اور لفظوں پر اپنی گرفت کا ثبوت تو دیا جا سکتا ہے لیکن غزل میں ایک طرح کا بوجھل پن سا آجاتا ہے جو شعر کی فوری تفہیم اور ابلاغ میں قدرے مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ کرنل مقبول نے روایت اور جدت کے بین بین چل

کر ہمارے سامنے جدید عہد کی بات جدید تر لہجے میں کہنے کی کوشش کی ہے اور یہی وقت کا تقاضا بھی ہے۔ کرنل مقبول نے انہی معیارات کے سانچے میں رکھ کر اپنی غزل کا خمیر اٹھایا ہے

خبر پہنچی جو طوفاں کی تو پھر ہم کو خیال آیا
محبت کے سمندر میں کوئی ساحل نہیں ہو گا
جسم ہیں فانی سو مٹ جائینگے
روح کیوں ان میں سمٹتی جائے

انہوں نے عام فہم، سادہ اور سلیس زبان استعمال کر کے چھوٹی بحر میں بڑی آسانی سے انتہائی مشکل اور بلیغ مضامین کو باندھا ہے۔ عام زندگی کے مشاہدات سے انہوں نے اپنی شاعری کا خمیر اٹھایا ہے اور ایک ماہر نقاش کی طرح منظر نگاری کی ہے۔ جیسے کینوس پر رنگوں سے کوئی مصور تصویر پینٹ کرتا ہے کرنل مقبول نے ویسی ہی مہارت اور فنی چابکدستی سے اپنی شاعری میں بہت سے مناظر پینٹ کر دیئے ہیں۔

پھرتے ہیں یونہی شہر میں کاسے کو اٹھائے
ہوتا ہے کہاں ایک فقیروں کا ٹھکانہ
یہ پرندے بھی چلے جائیں گے ہجرت کر کے
ان کو بھی گھونسلے کب کوئی بنا کر دے گا
اس کو معلوم بھی کیا اشک کی قیمت کیا ہے
جس نے دیکھا نہیں قطرے کو سمندر کر کے
الجھنیں بُنتی رہیں تاریک جالے اور میں
کہکشاں کی روشنی سمیٹتا ہی رہ گیا

کرنل مقبول ایک لمبا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں، انہوں نے ہمارے اجتماعی معاشرتی تضادات، قومی و ملی مسائل اور نفرت، بغض، منافرت اور انفرادی و اجتماعی بے حسی کو تخلیقی

شان کے ساتھ ہمارے سامنے لا رکھا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں ماضی و حال کے امتزاج سے مستقبل میں پیش آنے والے مسائل کا بڑا ابھر پورا اور جاندار نقشہ کھینچا ہے۔کسی بھی قاری کو اپنا شاندار ماضی، اپنے حال کی محرومیاں اور عصری نا آسودگیاں ......اور اپنے روشن مستقبل کی امیدیں سب کچھ اس شاعری کے آئینے میں نظر آئیں گی۔مجموعی طور پر شاعری کا یہ مجموعہ ایک دردمند انسان کا اپنے عہد کے اجتماعی خوابوں کا نوحہ ہے اور اس کے ماضی کا آئینہ بھی......مزید یہ کہ اس مجموعے میں ہمارے مستقبل کی امیدیں اور خواب بھی اس میں شامل ہیں۔کرنل مقبول کو بھی اپنے وطن، اپنی سرزمیں اور اس میں بسنے والے لوگوں سے اسی طرح پیار ہے کہ جس طرح کسی بھی محبِ وطن کو ہونا چاہیے وہ پھر سے اسی سرگم کا متلاشی ہے جس کے ساتوں سر پیار، امن اور محبت کا پیغام دیتے ہیں اسی لئے تو وہ یوں نوحہ کناں ہے:

بے کیف یوں ہوئی ہے فضا سارے باغ کی
پھولوں کی دھڑکنوں میں بھی سرگم نہیں رہا

کرنل مقبول نے زبان کو آرائشی انداز میں استعمال نہیں کیا بلکہ حقیقت کے پسِ پردہ ایک اور حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔کرنل مقبول کی غزل انصاف اور سچائی کی چتا پر ننگے پاؤں چل رہی ہے جس میں ہم اپنی اجتماعی ذات کے تینوں روپ بخوبی دیکھ سکتے ہیں......

رستوں میں اب کے خوف کا ایسا غبار تھا
غیروں سے اپنے گھر کا پتہ پوچھنے لگے

اپنی ہی ذات کا جو سب سے بڑا دشمن ہو
اس کو کون اپنی ہتھیلی کا مقدر دے گا

انسان اڑ رہا ہے مگر دیکھنا یہ ہے
کرتا ہے کس طرح سے سفر لامکان کا

یہ شاعری ہمارے اجتماعی عصری شعور کی نمائندگی کرنے کے قابل ہے۔کرنل مقبول کی

غزل پڑھ کر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ غزل اپنی روایت سے ابھی تک الگ نہیں ہوئی ...... بلکہ اس میں نئی زندگی، نئی روح اور نیا آہنگ سرایت کرتا جا رہا ہے جو ایک خوش آئند اور خوشگوار امر ہے:

زمین چھوڑ کے ہم ہی نہیں اُڑے ورنہ
ہمارے سامنے پرواز تھی تمہاری کیا

اتنا مرے خیال میں رہتا ہے کس لئے
تو وہم ہی نہ ہو کہیں میرے گمان کا

یہ مجموعہ کرنل مقبول حسین کی ''تپش'' اور ''دل خاموش سوالی سائیں'' کا تسلسل ضرور ہے، تاہم اس میں انہوں نے اپنی ذات میں چھپے ایک بہت اچھے، خوبصورت اور درد دل رکھنے والے شفیق انسان کو متعارف کرایا ہے۔ ہمیں اب یہ امید بھی رکھنی چاہیے کہ مستقبل میں وہ ہمیں اس سے بھی جاندار، بھرپور اور مضبوط شاعری سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کریں گے۔

☆ (کرنل مقبول حسین سید کی کتاب ''سر ساحل'' کا دیباچہ)

''دھمال''......اورغزل کا طلسماتی آہنگ

(کرنل سیّد مقبول حسین کی کتاب دھمال کے حوالے سے)

ایک نشہ دھمال میں ہے اب
رقص جب سے حباب میں دیکھا

کرنل سید مقبول حسین جو کچھ تخلیق کرتے ہیں یقیناً معیاری ہوتا ہے۔ان کی غزل اور نظم میں اگرچہ یہ تفریق کرنا آسان نہیں کہ کس کا پلہ زیادہ بھاری ہے۔مگر اُن کی منظومات کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اُن کی غزل،نظم کی نسبت زیادہ توانا ہے۔

اس شہر میں ہم نے کبھی آنا ہی نہیں تھا
اے یار یہاں ہم ترے اصرار سے آئے
پھر آئنہ بھی تیری طرح بولتا رہا
میں نے تو صرف عکس پہ رکھا تھا اپنا ہاتھ
ورنہ ممکن تھا کہاں شہر میں آنا تیرے
یہ تو پتوں کی طرح مجھ کو ہوا لے آئی

زندگی اور کائنات کے مختلف مسائل کے ادراک کے لئے انہوں جو نقطۂ نظر اپنایا ہے وہ اصول پرستی، میانہ روی، خالص عقلیت اور تقلید سے کوسوں دور ہےاور یہی وہ قدریں ہیں جو انہیں رومانوی شعراء کے زمرے میں شامل کر دیتی ہیں۔بہ الفاظِ دیگر شاعر اپنے کلام میں عقل سے زیادہ وجدان پر بھروسا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔رومانیت کا ایک خاصہ خود مرکزیت بھی ہےاور یہ خود مرکزیت ان کی شاعری میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ان کی شاعری بہ حیثیت مجموعی رومانوی اور موضوعی ہے ان کی غزلوں میں زندگی، محبت، عشق اور ہجر ووصال کے جذبوں کا اظہار بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ملتا ہے۔

زاویے اس کے بدن کے رقص میں ہیں
دل تو کہتا ہے انہیں ہم نظم کر دیں
جمالِ یار فقیروں پہ کر نظر کوئی
رہے گا یوں بھی کہاں سدا فسانہ ترا

سید مقبول حسین کی شخصیت جہاں اور بے شمار رنگوں سے مل کر تشکیل پاتی ہے وہاں ایک رنگ شاعری کا بھی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں نہ صرف عصری رجحانات کی نقش گری کی ہے بلکہ نئی احساساتی کیفیات اور نئے شعری تجربات سے نئی معنویتوں کے در بھی وا کیے ہیں۔ ان کی غزلیں شائستگی، جمالیاتی حسن، جدید رنگ آمیزیوں اور نئی محسوساتی آگہی کو ایک منفرد انداز سے پیش کرتی ہیں۔

رات جب بھی دیئے میں جلتی ہے
اک تری شکل ہی ابھرتی ہے
میں تو سورج بجھا کے بیٹھا ہوں
پھر بھی کیوں رات مجھ سے جلتی ہے

ان کی شاعری میں داخلی اور خارجی رویوں کا بڑا خوبصورت توازن ملتا ہے یعنی ایک طرف تو وہ ذاتی واردات قلب کو دل نشین انداز سے زبان عطا کرتے ہیں اور دوسری طرف اجتماعی حالات اور اس کے اضطراب کی پیکر تراشی کے لئے اظہار کی تمام قوتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اُن کے شعر جدید لسانی سانچوں میں ڈھل کر بھی روایت سے اپنا رشتہ بحال رکھتے ہیں۔

کل اسی شخص کے پڑھتے ہیں قصیدے سب نے
دار پہ آج جسے خلقِ خدا لے آئی
اسے چھو لوں تو میرے ہاتھ سے خوشبو نکلتی ہے
نہ جانے کون ہے جو پھول کے پیکر میں رہتا ہے

وہ ایک باریک بین اور ذہین شاعر ہیں۔ وہ چمکتی ہوئی ریت سے سونے کے ذرات پلکِ مژگاں سے چنتے ہیں اور خیالات کے سمندر کی گہرائی میں اتر کر معانی کے موتی تلاش کرتے ہیں۔ یعنی وہ سہل پسند انسان نہیں وہ کڑی منزلوں سے گزرنے کے بعد ہی اپنے خیالات کو فن کی سان پر چڑھا کر قطرہ قطرہ عرق اتارتے ہیں۔

تنہائی کا خیال ہی اتنا شدید تھا
میں اپنے آپ ہی سے کھڑا بولتا رہا
آنکھوں میں یوں سجے ہیں تری یاد کے چراغ
سونے کے باوجود بھی اک رتجگا رہا

''دھمال'' میں جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن پر پورے انہماک کے ساتھ غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ تب کہیں معانی کا سرا ہاتھ آتا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مشکل پسندی اُس کے میں رچی ہوئی ہے۔ بلکہ اس میں اُن کے افکار و خیالات کی بلند پروازی بھی ہے اور ایسے مضامین کو سلیقے سے باندھنے کا ہنر بھی ہمیں نظر آتا ہے۔ یہ شاعر کی پختہ خیالی اور اظہار کی فسوں گری کی علامت ہے۔

اس دھرتی کی چادر ہو یا اُس آکاش کا آنچل
دونوں جانب بنے ہوئے ہیں ایک ہی ہاتھ کے منظر
خوابوں کے بدلے آنکھیں گروی رکھنے والو
ایسے قید نہیں ہو سکتے احساسات کے منظر

ان کے اشعار و خیالات میں نیا پن ہے اور احساسات و جذبات میں ندرت ہے۔ صنفِ غزل کے تقاضے انہوں نے پوری نازبرداری کے ساتھ پورے کئے ہیں۔ وہ مشاہدات، احساسات اور جذبات سے شعر کے خدوخال یوں نکھارتے ہیں کہ اُن کا قاری اُن کی نظر کی گہرائی اور گیرائی میں کھو نہیں جاتا بلکہ ان کی غزل کے طلسماتی آہنگ سے بھی سحر

زدہ ہوکر رہ جاتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں معنی کے دریا اتار دینے کے ہنر سے واقف ہیں۔

ایسے لگتا ہے مری پرواز کے دن آ گئے
دے رہے ہیں اب پرندے اپنے بال و پر مجھے

ان کی تخلیقات لطیف انسانی جذبات اور بشری احساسات سے بڑھ کر آفاقی دکھائی دیتی ہیں۔ سید مقبول حسین کی شاعری کا سفر محبت کی معصومیت اور فنی ندرت کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ وہ رنگ برنگے پھول کھلائیں گے کہ جن کی خوشبو دور دور تک اور بہت عرصہ محسوس ہوتی رہے گی۔

ٹھیک نہیں ہے فانی چیزوں کی خاطر افسردہ رہنا
کون سنبھال کے رکھ سکتا ہے خوشبو، حسن، جوانی، رنگت

میں ان کی شاعری کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کی شاعری میں صوفیانہ شعری روایت اور اُس کے غالب عناصر بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بات بڑی حسبِ حال کرتا ہے

(شاکر کنڈان کی کتاب ''ہتھیلی پہ سورج'' پہ تبصرہ)

شاکر کی غزل کا سب سے اہم اور مرکزی مضمون سماجی ناہمواریوں پر فرد کے اندر کے کرب کا اظہار ہے۔لیکن اس نے اس کرب انگیز کیفیت کی تصویر کشی ایسے انداز میں کی ہے کہ بیزاری یا مایوسی کے عنصر کو نہ صرف اپنے کلام پر غالب نہیں آنے دیا بلکہ ہماری اجتماعی سماجی ناہمواریوں کے کرب کی شدید چبھن کے احساس کے باوجود زندگی کے لگاؤ کو برقرار رکھا ہے۔

چھت پہ گہری نیند سونے کے زمانے بھی گئے
گاؤں سے شہروں کی جانب کا سفر، کیسا رہا

اس نے اظہار کے لئے اپنی غزل میں جذبے کی سچائی کے علاوہ طرز بیان کے لئے نہایت سادہ اور سہل انداز اپنایا ہے۔ روزمرہ اور بول چال کی زبان استعمال کی ہے اس عام فہم زبان میں سنجیدہ افکار اور جذباتی سچائی اس طرح سموئی ہے کہ ادب کا سنجیدہ قاری کہیں بھی بوجھل پن محسوس نہیں کرتا۔ان کے اظہار کا بھولا بھالا انداز، لہجے کی مٹھاس اور عام معاشرتی رویوں کی جھلملاتی تصویریں گویا اس کی غزل کی جان ہیں۔

مجھے خبر ہے کہ تلخی ہے میرے لہجے میں
محبتیں نہ ملیں جب تو کیا کیا جائے

شاکر کی غزل میں غم کی چبھن کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوتی مگر تاثیر کی کمی نہیں۔ اس کی شاعری میں داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ خارجی کوائف کی مصوری بھی ملتی ہے۔اس خارجیت اور داخلیت کی خوشگوار آمیزش سے اس نے اپنی غزل کے سولہ سنگھار آمیخت کئے ہیں۔

آدمی تنہائی میں بھی آدمی دکھلائی دے
اس قدر کردار میں توثیق ہونی چاہیے

اس کی غزل کے تقریباً تمام شعر ہی پُر تاثیر اور با معنی ہیں۔اس کی غزل میں وہی گھلاوٹ،وہی انداز بیان،وہی شستہ لہجہ اور وہی پُر وقار مضامین ملتے ہیں جو خواجہ میر درد،اور میر تقی میر کی غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔

میں اک مدت تلک ٹھہرا رہا ہوں دوستوں میں
رویوں کا مجھے ادراک ہوتا جا رہا ہے!
مرا بازو پکڑ کر چلنے والا
مجھے رستہ دکھانے لگ گیا ہے

شاکر کا تصورِ زندگی ایسا ہے کہ اس میں غم ایک قدرتی سی بات معلوم ہوتی ہے۔اس کی غزل پڑھنے والا دل شکستہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی طبیعت کو توانائی ملتی ہے۔شاکر زندگی کے تجربات کو بیان کرتے وقت ان کے پسِ منظر میں چھپی حقیقتوں پر ایک فلسفی کی طرح نظر ڈالتا ہے۔وہ تجربات اور حقائق کا تجزیہ کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی غزل میں تاثیر اور لطف کے بہت سے پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔

شاکر کنڈان اور ماہیے کی روایت

شاکر کنڈان ایک شخص نہیں ایک انجمن ہے وہ اس لئے کہ اس ایک انسان کے اندر نجانے کتنے ہنگامے اور کتنی دنیائیں آباد ہیں۔ اس کی صورت جتنی بھولی بھالی اور گفتگو جتنی نستعلیق ہے یہ اتنا ہی زیادہ گنی ہے۔ شاعر ہونا کوئی جرم نہیں، محقق کہلانا کوئی عیب نہ سہی، مصنف، افسانہ نگار، یا مرتب ہونا بے شک برا کام نہیں لیکن ہر نئے کام پر چونکا دینا بھلے مانسوں والا کام ہرگز نہیں۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ پہلی ملاقات کا تاثر ہمیشہ آخری ہوتا ہے لیکن یہ بندہ ہر ملاقات پہ اک نئے رنگ وروپ کے ساتھ ہمارا منہ چڑا رہا ہوتا ہے۔ ابھی ہم اسی حیرت میں گم تھے کہ اس نے ''اردو ادب اور عساکرِ پاکستان'' جیسے کٹھن موضوع پر قلم کیسے اٹھایا اور کتنی مہارت سے اپنے انجام تک بھی پہنچایا کہ اس نے ایک اور قلابازی کھائی اور آج ''جلتے صحراؤں میں'' کھڑا آبلہ پائی اور تشنگی کا شکوہ کر رہا ہے۔ ہر ملاقات پہ نئے روپ سروپ میں ملنے والا یہ گنی آدمی کیا کہتا ہے یہ جاننے کے لئے آپ بھی بے تاب ہوں گے لیکن ٹھہریئے صاحب! میں آپ کو اس کی ماہیا نگاری پر اپنے تاثرات سے پہلے ''ماہیے کی روایت'' کے بارے میں بتاتا چلوں۔

ماہیا ہماری پنجابی ''رہتل'' یا ''وسیب'' کا ایک ایسا پھول ہے جو پنجابی زبان وادب کے ماتھے کا جھومر ہے۔ جب دیہاتوں کے لوگ موجودہ زمانے کی، نام نہاد ترقی سے ناآشنا تھے۔ ان کے دکھ، سکھ، غم، خوشیاں، دیواریں، محل، چوبارے، چوپالیں اور دارے سانجھے تھے اور آج کی منافقت اور منافرت ان سے ابھی کوسوں دور تھی۔ وہ لوگ سارا دن کام کرتے، جب تھک جاتے یا کام ختم کر لیتے اور انہیں اپنی اپنی چوپالوں، داروں یا ڈیروں پر آرام کرنے یا ستانے کا تھوڑا بہت وقت ملتا تو اس وقت انہیں تفریح طبع کے لئے شاعری سوجھتی اور اس شاعری میں وہ اپنا تمام تر سوز و گداز اور محبت شامل کر کے اپنے کسی بہت ہی پیارے کو مخاطب کر کے کبھی اس کا شکوہ کرتے، کبھی پیار کا اظہار کرتے اور کبھی دوسروں کو نصیحت کرتے۔ ایسی محفلوں میں ہجر،

فراق اور جدائی ہی ماہیے کے عمومی موضوعات ہوتے تاہم دیگر موضوعات بھی کثرت سے ملتے ہیں۔اور جب اپنا اپنا کام کرتے کرتے، چلتے پھرتے، مال مویشی چراتے ہوئے لوگ باگ ترنگ میں آ کر ماہیا الاپتے تو دور دور تک دلوں کی دھڑکنوں میں سما جاتا۔جس لے، ردھم اور سر میں وہ ''ماہیا'' الاپتے وہ دلوں میں گھر کر جاتی۔یوں ماہیے نے ہر قسم کے احساسات اور خصوصاً پنجاب کی ثقافت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔دراصل ماہیے کے موضوعات کی بنیاد حمد ونعت، عشق ومحبت، ہجر ووصال، دکھ، درد، خوشی اور غم وغیرہ ہیں۔اس میں تو صیف اور شکوے شکایت کا عنصر کچھ زیادہ ملتا ہے۔چند پنجابی ماہیے ملاحظہ فرمائیں:۔

(۱) دوتاراں چٹل دیاں /جدوں ماہی یاد آوے /ہائیں بل بل نکلدیاں

(۲) ہتھ جوڑا پکھیاں دا /لالے ساڈا ماہی لگدا /لالے چانن اکھیاں دا

(۳) مینہ وس گیا باراں تے /اللہ سائیں فضل کرے /پردیسیاں یاراں تے

(۴) ہتھ جوڑا پکھیاں دا /ساڈے ول تک ماہیا / کیہ جاندئی اکھیاں دا

ان ماہیوں میں جو خوبی اور خوبصورتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا پہلا مصرعہ یا لائن بامعنی تو ہے لیکن اس کا ربط اگلے دونوں مصرعوں سے محض قافیے اور بحر کا ہے۔اصل بامعنی اگلے دو مصرعے ہی ہیں جن میں مدعا یا خواہش کا اظہار کیا گیا ہے۔یہی پنجابی ماہیے کی خاصیت اور ہیت ہے البتہ اس کے اوزان کے بارے میں ایک بحث چل رہی ہے جس کا فیصلہ وقت کرے گا نقادیا لکھنے والے محض ٹولیوں یا حمایت اور مخالفت کی دھڑے بندیوں کا شکار ہورہے ہیں۔اور یہ بحث ابھی تک کسی بھی حتمی اور قابلِ قبول نتیجے تک نہیں پہنچی اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جب تک مستند عروضی اور ماہیا گو شعراء یہ متفقہ فیصلہ نہ کرلیں کہ ماہیے کے ارکان اور بحور کونسی ہونا چاہئیں اس وقت تک کسی ایک کی حمایت یا مخالفت کرنا ایسے ہی ہوگا جیسے بہت سی چیخوں میں کسی کو آواز دینا۔لہٰذا درمیانی مدت میں شعراء کو دونوں اوزان میں ماہیا لکھتے رہنا چاہیئے ۔یہ سلسلہ رکنا نہیں چاہیئے ورنہ رباعی، قطعہ، ثلاثی اور ہائیکو کی طرح ماہیے کی مقبولیت میں رفتہ رفتہ کمی آئے گی جو اس صنفِ سخن

کے زوال کا باعث بنے گی۔

اردو ماہیے کی روایت زیادہ پرانی نہیں۔ غالباً سب سے پہلے ہمیں حسرت کے ماہیے ملتے ہیں جو ایک فلم میں گائے گئے ایک اور روایت کے مطابق غلام جیلانی برق اور ہمت رائے شرما نے بھی اسی دہائی میں ماہیے لکھے لیکن حسرتؔ اور ہمت رائے شرماؔ نے ماہیا کے بجائے انہیں گیت ہی لکھا۔ تاہم غلام جیلانی برق نے ان کے لئے ماہیا کا لفظ ہی استعمال کیا۔ حیدر قریشی کے بقول نذیر فتح پوری بھارت میں پہلے اردو ماہیا نگار ہیں۔ اولیت کسی کی بھی ہو لیکن یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ ساحر لدھیانوی اور قمر جلال آبادی نے نہ صرف بہت خوبصورت اردو ماہیے لکھے بلکہ اپنے بعد آنے والوں کے لئے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دی۔ بہر حال اردو میں ماہیا نگاری کو ابھی ایک صدی نہیں ہوئی جبکہ پنجابی ماہیے کی روایت اور بنیاد صدیوں پر محیط ہے۔ جو سینہ بسینہ اور روایت کے طور پر ہمارے پنجاب میں پڑھا اور گایا جا رہا ہے۔ اس میں کسی ایک مخصوص شاعر کا نام نہیں لیا جا سکتا جبکہ اردو ماہیا نگاروں میں نئے لکھنے والوں کو چھوڑ کر چند نام ہی لئے جا سکتے ہیں۔

حسرت اور غلام جیلانی برق کے بعد پاکستان میں نمایاں ماہیا نگاروں میں اس وقت مجھے قمر جلالوی، الطاف مشہدی، امین خیال، علی محمد فرشی، نصیر احمد ناصر، ممتاز عارف، نثار ترابی، مسعود ہاشمی، حیدر قریشی، ذُہیر کنجاہی اور یعقوب فردوسی کے نام یاد آ رہے ہیں۔ اور ہندوستان میں ہمیں سب سے نمایاں نام ساحر لدھیانوی اور ڈاکٹر عاشق مناظر ہرگانوی کا ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ رشید اعجاز، نذیر فتح پوری، انور مینائی اور پروین کمار اشک نے بھی ماہیے کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اردو زبان کے دامن کو مالا مال کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ محمد مسعود ہاشمی کو ایک اور اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کا مختصر سا مجموعہ ''ساقیا'' کے نام سے غالباً ۱۹۷۲ء میں منظر عام پر آیا (جس کی فوٹو کاپی میرے پاس محفوظ ہے) یوں انہیں ایک طرح سے اولین مجموعہ کی بدولت دوسرے لوگوں پر اولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر عاشق مناظر ہرگانوی، رشید اعجاز، انور مینائی، ممتاز عارف، نصیر احمد ناصر، قمر ساحری، امین خیال، علی محمد فرشی، حیدر قریشی، نثار ترابی، مسعود

ہاشمی، زہیر کنجاہی اور پروین کمار اشک وغیرہ کا اپنا اپنا اسلوب اور رنگ ہے لیکن سبھی نے تقریباً ماہیے کا روایتی دیہی مزاج اور روایت کو نبھاتے ہوئے دیہات سے ہی اپنی تشبیہات اور استعارے لئے ہیں۔ کہیں کہیں جدید عہد کے استعارے کو اگر استعمال کیا بھی ہے تو ماہیے کی روایتی حیثیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ ان کے بعد ہمیں ماہیا لکھنے والے (خواتین و حضرات کا) ایک ہجوم نظر آتا ہے۔ گو کہ یہ ایک مستحسن اقدام ہے اور شاعری میں اظہار کے تمام پہلوؤں کی طرح ماہیا بھی باقاعدہ ایک صنفِ سخن کے طور پر سامنے آ چکا ہے لیکن ماہیے کے مخصوص مزاج اور لب و لہجے کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ماہیا نگاروں کے ہاں چونکا دینے والے خیالات اور بندشیں ہوں۔

ماہیا لکھنے والوں میں ایک اور نمایاں نام شاکر کنڈان کا ملتا ہے جس نے جستہ جستہ لکھنے کے بجائے ایک ہی جست میں سب سے اوپر والی سیڑھی پر آ کر بڑی مضبوطی سے قدم جمائے ہیں۔ شاکر چونکہ خود بھی پنجاب کی دھرتی کے سپوت ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ اردو اور پنجابی کے بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ اس لئے شاکر نے اپنے ماہیوں میں مخصوص پنجابی ''ریت''، روایت اور دیہی زندگی کے مناظر کو پینٹ کیا ہے اور یہی اس کے اردو ماہیوں کی خوبصورتی اور دلکشی کا باعث ہے۔ اس نے نہ تو شہری زندگی کے سٹائل کو اپنایا ہے اور نہ ہی مشکل تشبیہات اور استعارے شامل کئے ہیں بلکہ سادہ، سہل اور عام فہم اردو زبان کو استعمال کر کے اپنے ماہیوں کے حسن و دلکشی میں اضافہ کیا ہے۔ ویسے بھی بھاری تراکیب، نامانوس الفاظ اور مشکل استعارے تفہیم شاعری میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ شاکر نے اپنے ماہیوں کا آغاز حمد و نعت سے کر کے خداوند تعالیٰ اور اس کے محبوب ﷺ سے اپنے قلبی تعلق اور دلی محبت و اخلاص کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ ایک مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ کسی بھی کام کا آغاز کرتے وقت اپنے اللہ اور اس کے حبیب پاک ﷺ کے نام سے ابتدا کرے۔ ویسے بھی شاکر حمد و نعت کا دیوانہ ہے۔ نمونے کے طور پر کچھ ماہیے ملاحظہ فرمائیں:

(۱) رحمان و رحیم ہے وہ/مالک ہر شے کا/اعلیٰ ہے عظیم ہے وہ

(۲) مانگیں ہیں مدد تجھ سے/بخشش خداوندا/ہو وے جو خطا مجھ سے

(۳) ہر چیز فضول چناں/میرے لیے کافی/رب اور رسولؐ چناں

(۴) توقیر حرم ماہیا/آج میں جو کچھ ہوں/ہے اس کا کرم ماہیا

شاکر نے اپنے ماہیوں میں گاؤں کی زندگی کے وہی منظر پینٹ کئے ہیں جو کسی بھی خالص پنجابی گاؤں کے ہو سکتے ہیں ۔ فلمی انداز سے اس نے سیٹ نہیں لگائے کہ غریب کی جھونپڑی میں سنار کی دکان اور ایک مفلوک الحال فقیر کی کٹی میں بیوٹی کلب کی آسائشیں مہیا کر دی گئی ہوں ۔ بلکہ اس نے گاؤں کی گلیوں، کنوؤں کی منڈیروں، پرندوں، جھرنوں، پن چکی کی مدھر تانوں اور گاؤں کے جوہڑوں، کیکر کے پھولوں، شیشم کے درختوں، کھلیانوں، وسیع میدانوں، پیڑوں کے جھنڈ اور ہجر و فراق کے امتزاج سے ایک ایسا ماحول تراشا ہے کہ جس میں حقیقی دیہاتی زندگی اور پنجاب کی ثقافت کے سب مناظر قاری کے سامنے آ جاتے ہیں ۔

(۱) کیکر کی چھاؤں میں/ایک کشش سی ہے/کیسی تیرے ناؤں میں

(۲) اب خون رلاتی ہے/چھاؤں شیشم کی/تیری یاد دلاتی ہے

(۳) ان چھلبل اکھیوں میں/اور بھی بجتی ہے/وہ سوہنی سکھیوں میں

(۴) جلتے انگاروں کی/کیا تعبیر کریں/تیرے جھوٹے "لاروں" کی

(۵) برگد کی چھاؤں کو/رہ کر شہروں میں/بھولا نہیں گاؤں کو

(۶) خوشبو ہے گلابوں میں/خوش ہو لیتے ہیں/ہم کھو کر خوابوں میں

(۷) کچھ پھول اُگا رکھو/ماہیے نے آنا ہے/ویرانہ سجا رکھو

(۸) ماچس کی تیلی تھی/وقتِ جدائی تو/وہ آنکھ بھی گیلی تھی

(۹) گھڑا بھر لیں پانی سے/ہاتھ ملا دیکھیں/ذرا روٹھی جوانی سے

اپنی سرزمین سے محبت اور وفاداری کسی بھی انسان کی حب الوطنی کو پرکھنے کا بہترین

ذریعہ ہے۔اسی جذبہ سے انسان کی اپنی مٹی اور ملک سے محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ایک محبِّ وطن تو ہر سانس کے ساتھ اپنے ملک کی سلامتی اور سالمیت کے لئے دعا گو رہتا ہے۔وطن کی سرحدوں کی حفاظت ایک سپاہی سے زیادہ کون کر سکتا ہے۔شاکر کنڈان بھی بنیادی طور پر ایک سپاہی ہے اور سپاہی کبھی اپنے فرض اور قرض کو نہیں بھولتا۔شاکر نے کشمیر کی آزادی، وطن کی سالمیت اور حریتِ فکر وخیال کے جذبوں کو بھی اسی عقیدت کے ساتھ بھرپور انداز میں اجاگر کیا ہے۔ملاحظہ فرمایئے:

(۱)بڑی راج دلاری ہے/خاک وطن کی تو/ہمیں جان سے پیاری ہے

(۲) بیتے ہیں وقت کڑے/ہر میدان میں ہم/کشمیر کی جنگ لڑے

(۳)بس اتنا ارادہ ہے/اپنے وطن سے تو/جاں دینے کا وعدہ ہے

شاکر نظم ونثر اور خاص طور پر میدانِ تحقیق کا شہسوار ہے اور اس نے ماہیے کی روایت کو بڑی مہارت اور خوبصورتی سے نبھایا ہے وہ کئی ایک نئے امکانات لئے پوری آب وتاب کے ساتھ اس منظرنامے پر اُبھرا ہے۔ اس کے ہاں پنجاب کی سرزمین کے تاریخی شعور کے خدوخال بڑے واضح اور بھرپور انداز میں اجاگر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔جو اس کے تخلیقی شعور میں بہت سے نئے رجحانات اور امکانات کے عکاس بھی ہیں۔شاکر نے بہت سے خالص پنجابی الفاظ کو اس خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ اردو زبان میں شامل ہو کر وہ اور زیادہ بامعنی نظر آنے لگے ہیں۔شاکر کے ہاں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور ان کے ہاں ہمیں ایک اچھوتا اور نیا پن نظر آتا ہے جو شاکر کی اگلی اڑان کے مزید اونچا ہونے کے امکانات کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

اختراعی بابا......اختر رضا سلیمی

جس کتاب سے زیادہ اس کے ''دیباچے'' پر بحث ہوئی ہے اس کا تخلیق کار وہ شخص ہے کہ جس کی دوستی پر فخر کرنا میں اپنا استحقاق سمجھتا ہوں ۔اس افتخار کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ وہ نوجوان شعرا میں ایک قد آور اور نمائندہ شاعر ہے بلکہ اس فخر کی وجہ اس کا وہ قلندرانہ مزاج ہے جو کسی کسی کے نصیب میں آتا ہے۔جس طرح صاحب اولاد ہونا خوشی کی بات ضرور ہے لیکن نیک اور سعادت مند اولاد ابدی خوشیوں کی ضمانت ہوتی ہے اسی طرح صاحبِ کتاب ہونا بڑی بات نہیں بلکہ ''معیاری کتاب'' کا ہونا انتہائی ضروری ہے ۔وہ مقدار سے زیادہ معیار کو اہمیت دینے والا واحد شاعر ہے۔صاحبِ علم لوگوں کی عزت کرنا اس کا وطیرہ ہے اور اہلِ علم کی محفلوں میں گھنٹوں بیٹھنا اس کا شغل ہے۔اس میں ذاتی طور پر اس کا کوئی قصور نہیں بلکہ یہ سب کیا دھرا اس کے قلندرانہ مزاج کا ہے۔میرؔ اس کا پسندیدہ شاعر ہے لیکن غالبؔ کے گن گاتا پھرتا ہے۔پرویز کی نثر کی تعریف کر رہا ہو تو سمجھیں کہ مولانا مودودی کے تبحرِ علمی پر بصیرت افروز لیکچر آیا کہ آیا۔بات افضل گوہر سے شروع کرتا ہے اور خاتمہ افتخار عارف پہ کرتا ہے...... سلطان رشک کا ذکر کرتے کرتے اختر عثمان کے ساتھ پہروں ہونے والے مکالمے کی روداد کہنا شروع کر دیتا ہے......احمد حسین مجاہد کی تعریف کرتے کرتے اقبال کوثرؔ کے شعر سنانا شروع کر دے گا۔ افتخار مغل کے اوصاف بیان کرتے کرتے ریاض عادل کی برائیاں شروع کر دیتا ہے۔ ہے نا درویشانہ روش؟

بہت عرصہ پہلے جب سخت قسم کی علمی ریاضت اور درویشانہ ''چلّہ کشی'' کا دور چل رہا تھا وہ اکثر اونگھتے اونگھتے مجھے اختر عثمان کے شعر سنایا کرتا تھا۔ مجھے اسی وقت شک ہو گیا تھا کہ یہ ''بابا'' اب کچھ کر گزرے گا۔اپنے خوبصورت شعر دوسروں کا نام لے کر سنانا اس کی ''ہابی'' ہے۔کرنل مقبول حسین کے ساتھ جب اس کے ''پھیرے'' شروع ہوئے تو میرا گمان یقین میں بدلتا نظر آیا......اور پھر اس کے اختراعی ذہن میں جو بات چھپی تھی وہ ''اختراع'' کی صورت میں ظہور پذیر

ہو گئی۔

اپنی کتاب کا دیباچہ اس نے خود ہی لکھا ہے اس لئے اس پر انگلی اُٹھانے کا جرم ریاض عادل سے بہتر کسی سے سرزد ہو ہی نہیں سکتا لہٰذا یہ کام اب ریاض عادل کے پلڑے میں ڈالا جاتا ہے......اقبالؒ نے جب ''سر نیتر اشد قلندری دانند'' والا شعر کہا تھا اس وقت شاید قلندر لوگ ''ٹنڈ'' کرواتے تھے لیکن اب پلوں کے نیچے سے ڈھیروں پانی گزر گیا ہے......عصرِ جدید کے قلندر شاید اب اس پابندی سے آزاد ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اب تو ایسے قلندر آ رہے ہیں جو یوں نعرۂ مستانہ لگاتے ہیں:

کوئی صدا نہیں گونجے گی میرے بعد یہاں
مجھے سنو کہ یہاں آخری صدا ہوں میں

جی ہاں! یہ اختر رضا سلیمی کا شعر ہے......شاعر کتنا پُر اعتماد ہے۔ دونوں مصرعوں میں ''صدا'' کی تکرار نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے......نوجوان شعراء میں ایسے لوگ خال خال ہی ہوں گے۔

الفاظ کے ساتھ ساتھ جدت اور تنوع بھی شعری تجربے کی تاثیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ شعری تجربات میں تنوع پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شاعر ہر لحاظ سے کامل ہو......یہی وجہ ہے کہ باشعور اور ہنر مند شاعر موقع محل کی مناسبت سے فنی ذرائع استعمال کرتا ہے اور وہ اپنے شعری تجربے سے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس کے شعری تجربات کی قدر و قیمت تعداد کے بجائے فنی خوبی پر منحصر ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''ذوق انسانی نفس کی ایک ایسی جمالی قوت ہے جو حسن کا ادراک کرتی ہے، اس کا رویہ مقرر کرتی ہے اور تخلیقی عمل یعنی جمال کی پیکر تراشی میں معیار کی نگہبان اور پاسبان ہوتی ہے''۔ اختر رضا سلیمی نے اپنی شاعری کا ایک معیار مقرر کر رکھا ہے اور جب اس کا فنی تجربہ اور جمالیاتی ذوق مل کر اعلیٰ تخلیقی سطح پر پہنچ نہیں جاتا وہ شعر کی مسلسل کرافٹنگ میں لگا رہتا ہے......اس کی اسی فنی ریاضت اور جمالیاتی قوت کی بدولت اس کے اشعار

فن اور معیار کی مقراض پر پورا اترتے ہیں۔

رموزِ نکہتِ گُل جو کُھلے گُلوں پہ عیاں
صبا کا نامہ مرے نام پھر نہیں آیا
محسوس تو کرتا ہوں ترے لمس کو لیکن
کیا چیز ہے اس لمس کے اندر نہیں کھلتا

وہ شعر کو تجربے اور مشاہدے کی کٹھالی میں ڈال کر تجزیے اور فنی صلاحیت کی مقراض پہ تولتا رہتا ہے۔ بارہا خیالات کی غلام گردشوں میں گم رہ کر جب وہ سرِ ساحل ابھرتا ہے تو اپنے جذبے کی سچائی کے بل بوتے پر ایسا فن پارہ تراش کرلاتا ہے کہ سننے والا دنگ رہ جاتا ہے۔

بس ایک ہیولا سا نظر آتا ہے سب کو
میں کون ہوں میں کیا ہوں کسی پر نہیں کھلتا
کبھی تو زیرِ نگیں آئے گی زمینِ نشاط
کہ میں نے سلطنتِ غم پہ حکمرانی کی

زندگی میں خارجی اور داخلی، انفرادی اور اجتماعی طور پر جو جو واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں اور ان کی بدولت جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اس کا اثر لامحالہ افراد کے اذہان پر بھی پڑتا ہے۔ اختر رضا سلیمی کی غزل میں ان اثرات کا پرتو موجود ہے۔ اس کی غزل میں داخلی وخارجی اور انفرادی واجتماعی ماحول اور آس پاس کی حقیقتوں کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہیں۔

بدلنا چاہتے ہو گر مزاج گلشن کا
تو دوستو! ذرا بدلو صبا کا لہجہ بھی
بپا ہوئے ہیں کئی کربلا یہاں صاحب!
مگر بجھی نہیں ہے پیاس پھر بھی پانی کی

سلوک اور معرفت ہمارے ادب کا ایک انمول حصہ رہا ہے۔ صوفی شعرا کے خصوصی

مطالعے اور اہلِ سلوک کی مجلسوں میں شرکت کرنے کی سعادت نے اختر رضا سلیمی کو عرفان اور وجدان کی ''ذو معنی رمزوں'' سے آشنائی دلائی ہے۔ وہ بڑے دبنگ لہجے میں صوفیانہ اسرار و رموز سے لبریز ایسے ایسے شعر کہہ جاتا ہے کہ جن کی ہر قرأت پر نئے معانی کی پرتیں کھلتی ہیں اسی وجہ سے حلقۂ یاراں میں اسے ''بابا'' کہہ کر پکارا جاتا ہے:

یہ سوچتا ہوں کہ کچھ بھی نہیں ہے میرے سوا
کبھی کبھی تو رضاؔ یوں بھی سوچتا ہوں میں

میں جھیلتا ہوں شب و روز آگہی کے عذاب
نگاہِ عقدہ کشا کیوں مجھے عطا کی ہے

مجھے نگاہ میں رکھ کر مری غزل دیکھو
کھلیں گی تم پہ بھی پرتیں کئی معانی کی

☆......اختر رضا سلیمی کی پہلی کتاب ''اختراع'' پر تاثرات

افضل گوہر راؤ کی ''اچانک'' اڑان

جارج ایلیٹ کہتا ہے کہ ''جب میں لکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرے ذہن وقلم پر کسی دوسرے کا قبضہ ہو۔''......اے ای ہاؤس مین لکھتا ہے کہ ''میں سمجھتا ہوں شاعری فاعلی سے زیادہ مفعولی کام ہے......رضا کارانہ طور پر کیا جانے والا کام...... جب میں شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہوں تو میری شاعری کے سوتے پھوٹتے ہیں'' اسی طرح کہا گیا کہ گوئٹے نے اپنا ناول خوب کی دنیا میں بیٹھ کر لکھا تھا...... بلیک نے اپنی عظیم ترین تصاویر جاگتی نیند میں مصور کیں تھیں......کولرج نے ''قبلائی خان'' بے خبری کی کیفیت میں لکھا وغیرہ......میرے خیال میں جب تخلیق کار کسی تخلیقی کام پر اپنی توجہ مرتکز کرتا ہے تو وہ دوسرے تمام مسئلوں سے لاتعلق ہو جاتا ہے اور میرا پختہ یقین ہے کہ گوئٹے، بلیک، سٹیون سن، والٹیئر، جارج ایلیٹ یا ہاؤس کی خواب ناک کیفیت اسی توجہ کا نقطۂ عروج تھی، انہوں نے خواب نہیں دیکھے بلکہ ایسا انہوں نے ادبی معنوں میں کہا ہے۔ دراصل وہ اپنی توجہ کے حد درجہ ارتکاز کو ایسی مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کرنا چاہتے تھے جو فنکار اپنی تخلیق کی خوبصورتی کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے اور میں ایسی ہی تخلیقی وادبی مبالغہ آرائی کے ساتھ یہ کہوں گا کہ افضل گوہر راؤ اس عہد کا خواب کی دنیا میں بیٹھ کر فکر وفن کے چمکتے جگنو چھوڑنے والا ایک ایسا شاعر ہے کہ جو انتہائی تخلیقی ریاضت اور ذہنی مشقت کے بعد اپنے کلام کو لے کر ''اچانک'' ہمارے سامنے آ بیٹھا ہے......حالانکہ وہ خود کہتا ہے:

یونہی اچانک کہاں کسی کو سوچنا آتا ہے
آہستہ آہستہ یہ بیماری لگتی ہے

بلاشبہ اردو غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو ہر زمانے میں ایک زندہ روایت رہی ہے اور اس میں نت نئے تخیلی تجربات اور اسلوب کے ساتھ مضبوطی آتی رہی لیکن اس روایت کو آگے بڑھانے کی عمل جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل اور کٹھن بھی۔ اردو غزل کی بنیاد ولی، میر، مصحفی اور

درد نے رکھی لیکن اس کی انتہا شاید لا متناہا ہے۔ شاعر اپنے دور کا آئینہ ہوتا ہے ہر ایک نے اپنے دور کا عکس اگلے عہد کے شاعر کے آئینے میں منتقل کیا اور یہ عمل عہد بہ عہد ابھی تک آگے کی جانب سرگرمِ سفر ہے اور یوں اس صنفِ سخن کے قد و قامت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر عہد میں چند ایسے تخلیق کار ضرور ہوئے ہیں کہ جنہوں نے دامنِ غزل میں مزید پھولوں اور خوشبوؤں کا اضافہ کیا۔

احمد فراز اور افتخار عارف جیسے دو معتبر اور عہد ساز شعرا کی طرف میدانِ غزل میں سندِ پذیرائی اور محمد اظہار الحق کی طرف سے پکے اور اصل شاعر کا تغرہ لے کر میدان میں اترنے والے غزل گو شاعر افضل گوہر راؤ کا ایک سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل اولین شعری مجموعہ ''اچانک'' جیسے ہی منظرِ عام پر آیا، اس کے جوہر مزید نکھر اور سنور کر سب کے سامنے آ گئے۔ وہ ایک مدت سے غزل کے میدان میں اپنے فن اور تخیل کی شمع جلائے ہوئے ہے۔ جدید غزل گو شعرا میں ایک نمایاں ترین مقام پر کھڑا یہ شاعر محض جودتِ فکر اور ندرتِ احساس کا شاعر ہی نہیں بلکہ وہ ہیت کی فنکارانہ اپچ کا بھی مالک ہے۔ افضل گوہر راؤ کی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے واضح طور پر یہ بات محسوس کی جا سکتی ہے کہ وہ پہلے سے دریافت شدہ ہیت کو بار بار استعمال نہیں کرتا بلکہ قدم قدم پر نوکاری کو فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کرتا ہے:

لڑنے والا دوستی کا مستحق ہوتا نہیں
تُو مرے دشمن کو تحفے میں مری اجرک نہ دے

قحط ایسا پڑ گیا تھا موسمِ پرواز میں
بھوک لگنے پر پرندہ اپنے ہی پَر کھا گیا

تو نے تو میرا جسم بھی بے نور کر دیا
میں نے دیا تھا صرف چمکنے کا حق تجھے

اب اُسے بچانے میں خود سے لڑنا پڑتا ہے
وہ جو ہار کر مجھ سے اب مری امان میں ہے

افضل گوہر راؤ ایک ایسا شاعر ہے جو اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے ہر بار نئے اور دشوار راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ پہلے سے معلوم اور طے شدہ راستوں پر چلنا اس کی جدت پسند طبعیت کو گوارا نہیں۔ افضل گوہر راؤ بالیدگیِ فکر و نظر کا شاعر ہے اس کے ہاں ٹھہراؤ اور جمود نہیں ...... وہ مخالف کو للکارتا اور مقابلے و مبارزت کی دعوت دیتا ہے اسے زندگی کی ہنگامہ خیزیوں کے درمیان رہ کر ہی مزہ آتا ہے۔ اسے نئے نئے چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کا فن بخوبی آتا ہے۔ وہ ہمت و جراُت سے کام لینے والا انسان ہے اور ایسے ہی قبیل کے لوگوں سے اسے محبت اور انس ہے۔ وہ کم ہمت اور کم حوصلہ لوگوں کی بھی اپنے ہی انداز میں **motivation** کرتا ہے کہ جس سے ایسے لوگوں کو نہ صرف راہنمائی ملتی ہے بلکہ انہیں زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا گر بھی ہاتھ آتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمایئے:

لانی ہے جوئے شیر تو تیشہ اٹھایئے
شیشوں سے ٹوٹتے نہیں پتھر چٹان کے

اس نے دیا چٹان سے پتھر تراش کر
میں نے لگا دیا اسے پیوند ماس کا

کھلے سمندر کو کیوں حدوں میں سمیٹتے ہو
بپھر گیا تو کوئی کنارا نہیں رہے گا

اس کے دشمن نے اگر کاٹ دیئے ہاتھ تو کیا
اب کے دانتوں سے پکڑ کر وہ علم نکلے گا

وہ ہمہ وقت متحرک، فعال اور مضطرب صورتِ حال سے مقابلہ کرنے کو تیار نظر آتا ہے۔ اور اسی خوبی نے اسے حیات و کائنات، عصری صورتِ حالات، اور وسیع و عریض میدانوں

اوران پر بسنے والے باشندوں کی تکالیف کا عمیق اور گہری نظر سے مشاہدہ کرنے کی صلاحیت سے مالا مال کر دیا ہے۔ یوں وہ فکر و تامل کو اپنی غزل کے اشعار میں انتہائی مہارت اور حیرت انگیز حسن کاری کے ساتھ سمو کر ہمارے سامنے لاتا ہے:

جب بھی آئے گا مری قامت کے سورج کو زوال
روشنی کے رنگ اتریں گے ترے پیکر سے بھی
کھیتوں کی سیم اگتا ہوا رزق کھا گئی
جب سے بسے ہیں شہر میں بیٹے کسان کے
سر برہنہ شہر کی سڑکوں پہ کیا نکلے کوئی
پاؤں کے پتھر بھی اب سر کی طرف آنے لگے

قدرتی اور فطری مناظر کشی میں وہ بانکپن ہے کہ اعلیٰ درجے کے مصور کے خوبصورت رنگ لفظوں میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لسانی پاکیزگی، سلاست اور واقعاتی منظر کشی میں وہ بسا اوقات ایسا ترفع اور تحیر پیدا کرتا ہے کہ قاری چونک جاتا ہے:

تو مری پرستش سے بچ کے جا نہیں سکتا
میں تجھے تراشوں گا تُو اگر چٹان میں ہے
پر پرواز کی طاقت کوئی صیاد کیا جانے
پرندہ کتنا اُڑتا ہے یہ اُس کے پر سمجھتے ہیں
زمیں پر رینگتے کیڑوں کو مت تحقیر سے دیکھو
نجانے کون سے موسم میں کس کے پر نکل آئیں

لفظوں کا انتخاب اور ان کی ترکیب بندی میں اسے ید طولیٰ حاصل ہے۔ صحتِ لفظی کے ساتھ ساتھ رعایتِ لفظی میں بھی یگانہ روزگار ہے۔ مجموعے میں الفاظ کی نشست و برخاست کا ایسا سلیقہ برتا گیا ہے کہ حرف حرف نکھرتا نظر آتا ہے۔ اس کے طرز بیان میں شوخی، رنگینی، سنگینی

اور زورِ بیانی کے مختلف دھارے باہم گرا ایک دوسرے میں بہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مہارت کا یہ عالم کہ نئی اور مشکل زمین کو بڑی روانی اور آسانی کے ساتھ پامال کر کے رکھ چھوڑا ہے۔ سنگلاخ سے سنگلاخ زمین کو ہموار کر کے رکھ دیا ہے۔ مشکل سے مشکل قافیہ پانی کر دکھایا ہے۔ اس کا فن اپنے عہد کا سچا آئینہ ہے جس میں چھوٹے بڑے، واضح مبہم اور غیر واضح سبھی عکس ابھرے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے ہاں مشترکہ شعور کی سطح کا موثر ارتفاع بھی بہت زیادہ نظر آتا ہے۔

بہت ہے حبس اب تو سر سے بارِ ابتلا اترے
ہلاؤ ٹہنیاں شاید درختوں سے ہوا اترے
منزل کے واسطے کبھی روشن لکیر تھا
یہ راستہ جو گھاس سے ہے اب اٹا ہوا

حقیقت یہ ہے کہ جذبوں کی شدت، احساس کی فراوانی اور بلند آہنگی نے افضل گوہر کو گہر بنا دیا ہے۔ گو کہ شعری آہنگ میں صوت و معنی کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تخلیق شعر کے وقت شاعر کے تخیل میں یہ دو الگ الگ عمل نہیں ہوتے بلکہ شعر دونوں کے اتصال اور اکائی سے جنم لیتا ہے، تاہم افضل کی تخلیقی شخصیت میں اس کے مزاج کی دردمندی، گداز، رومانوی افسردگی، عمیق مشاہدے کی حس اور نیاز مندی جیسے شخصی اوصاف نے اس کے شعری آہنگ کو نرم، دھیما اور خوش رنگ بنا دیا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ مجموعہ نہ صرف پڑھنے کی چیز ہے بلکہ صاحبِ ذوق دوستوں اور قدر دانوں کو بھی پڑھوانے والی شاعری ہے۔

......

☆...... افضل گوہر راؤ کی پہلی کتاب "اچانک" پر تاثرات

شعراء کے ''ہجوم'' میں تنہا آدمی......افضل گوہر راؤ

افضل گوہر راؤ کی دوسری کتاب ''ہجوم'' کے نام سے حسبِ روایت اور حسبِ معمول کرنل مقبول حسین سید نے اپنے ادارے ''حرف اکادمی'' کے تحت شائع کی ہے۔اس کتاب کا ''دی ......باچہ'' ہمارے ایک دیرینہ دوست اور نابالغ بابے کی معرفت سے لبریز رمز شناسیوں کی نظر ہوگیا ہے حالانکہ اگر یہ ''دی ......باچہ'' نہ لکھا جاتا تو بھی ریاض عادل اور میں جانتے تھے کہ افضل گوہر کے بارے میں اختر رضا سلیمی کی کیا رائے ہوسکتی ہے۔ یہ بات بھی ہمارے ناقص فہم میں تھی کہ افضل گوہر راؤ ایک لاابالی، کھلنڈرا اور یارباش قسم کا نوجوان ہے جو شاعری کرتا نہیں بلکہ یہ غلطی اس سے زبردستی سرزد ہو جاتی ہے۔

اختر رضا سلیمی نے ''ہجوم'' کے دیباچے میں ''افضل گوہر راؤ'' کا جو حدود اربعہ دریافت کیا ہے اس کی روشنی میں یہ بات طے کر دی گئی تھی کہ ''ہجوم'' پڑھنے کے لئے دو چار قاری ہی دستیاب ہوں گے اور خوش قسمتی سے ریاض عادل کے بعد میں ہی تیسرا دستیاب قاری ہوں۔ لہٰذا میری اخلاقی ذمہ داری کا اس سے بہتر اور کوئی ثبوت ہو نہیں سکتا کہ میں شعراء کے ایک لامتناہی ہجوم میں سے اُس تنہا آدمی کو تلاش کرنے کی مقدور بھر کوشش کروں کہ جسے لوگ ''افضل گوہر راؤ'' کے نام سے جانتے ہیں۔

جب سے انسانی تہذیب نے جنم لیا ہے اس وقت سے لے کر آج تک شاعری نے علیحدہ علیحدہ تحریری صورتوں میں اظہار کا وسیلہ تلاش کر لیا ہے۔آج تک شاعری کی بیشمار تعریفیں کی گئی ہیں اور اس موضوع پر اتنی کتابیں اور رسالے موجود ہیں کہ کتابوں کے اس ڈھیر نے شاعری کے میٹھے سمندر کو کھارا بنا دیا ہے۔ عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ شاعر کی ذات اور آدمی کی شخصیت دو الگ الگ پہلو ہوتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دونوں کو جدا جدا خانوں میں رکھ کر دیکھنا ایسے ہی

ہے جیسے تن سے جان جدا کر دی جاتی ہے.....میرے خیال میں شاعر کی ذات اور آدمی کی شخصیت کو آنکھ میں کاجل اور سانس میں ہوا کے مترادف سمجھنا چاہئیے۔ لیکن جب ہم افضل گوہر کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ عام زندگی سے میل نہیں کھاتی اور جب اسے عام آدمی کے زاویئے پر رکھ کر پرکھنا شروع کرتے ہیں تو اس کی شاعری درمیان میں حائل ہو جاتی ہے۔ افضل گوہر کی شاعری نہ تو عظیم شاعری ہے اور نہ ہی بین الاقوامی، نہ افادی اور نہ ہی غیر افادی البتہ یہ شاعری ایک ''سچ'' ہے اور اس سچی شاعری کے پیچھے ایک مسئلہ اور بھی ہے وہ یہ کہ افضل گوہر کی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ ''شاعری'' ہی ہے اور ''بحیثیت شاعر'' جینے کے لئے اسے زندگی میں بڑے سے بڑا نقصان بھی برداشت کرنا پڑے تو بڑے حوصلے اور طنطنے کے ساتھ برداشت کر جاتا ہے۔

یہی تو سچ ہے جسے تو فسانہ جانتا ہے
ہمیں بھی تیری طرح اک زمانہ جانتا ہے

شاعری دراصل اک ہمہ وقتی کام ہے یا پھر فرصت کے لمحوں کی چھیڑ چھاڑ......ہمارے ہاں اکثر شعراء جب تیس، پینتیس کے پیٹے میں پہنچتے ہیں تو تخلیقی طور پر ہانپنا کانپنا شروع ہو جاتے ہیں۔ عمر کے باقی حصے میں یا تو وہ گونگے ہو جاتے ہیں یا پھر بقول شخصے ''جگالی'' کرتے رہتے ہیں۔ تخلیقی سوتوں کے اُجاڑ پن کے پیچھے جو محرکات ہیں ان میں نمایاں طور پر ان کی ''جذباتی اور خیالی زندگی کے ساتھ جڑی ہوئی لاشعوری الجھنیں'' ہوتی ہیں۔ افضل گوہر کی شاعری صوفیانہ رنگ سے بالکل خالی ہے......وہ دوسرے شاعروں کی طرح زیادہ اونچی قلانچیں نہیں بھرتا......وہ زمین پر رہ کر ہی زمین کی باتیں کرتا ہے۔ اس کا عشق عام انسانی سطح کا عشق ہے جس میں نارسائی اور ناتمامی کے کانٹے بھی ہیں۔ اس کی اکثر غزلوں میں اس ناتمامی کا گہرا احساس موجود ہے اور اس کے لہجے میں گھٹی گھٹی جھنجھلاہٹ کا اظہار بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

تو نے کیا دل کی جگہ رکھا ہے پتھر مجھ میں
غم سے بھر جاؤں بھی تو رونا نہیں آتا ہے

تشنگی سے جاں بلب ہیں تو کوئی دریا اُچھال
جب نہ ہو پانی تو چھلکے گی لبوں سے پیاس کیا

افضل گوہر کی شاعری کا پُر لطف حصہ وہ ہے جہاں اس نے اپنی نا تمامی کے احساس کو رمزیہ پیرائے میں بیان کیا ہے اور دل پر اترنے والی کیفیتوں کی ترجمانی سے اپنے قلم کو بھی نہیں روکا.....خارجی کوائف کے لئے رمزی پیرایۂ اظہار کا بیان اور داخلی تاثرات کی ہلکی چاشنی کے تال میل نے افضل گوہر کی شاعری میں ایک جیتے جاگتے شاعر کو جنم دیا ہے۔

کسی نے میری زمیں چھان کر نہیں دیکھی
وگرنہ کتنے ستارے یہاں پڑے ہوئے ہیں

اُس خواب کا اسیر ہوا ہوں کہ دن میں بھی
آنکھوں کو موند لوں تو نظارہ اترتا ہے

کسی بھی تخلیق کار کی تخلیقی صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے لئے انفرادیت، جدت اور نوکاری بنیادی عوامل سمجھے جاتے ہیں۔شاعر کے لئے انسانی جذبات اور احساسات کی عکاسی کے لئے نت نئی لفظیات اور تراکیب کا ہونا انتہائی لازمی سمجھا جاتا ہے اور افضل گوہر اس خوبی سے مالا مال ہے۔افضل گوہر پرانی لفظیات کی جگالی نہیں کرتا .....فرد اور معاشرے کو درپیش مسائل کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے اور نت نئی تراکیب استعمال کر کے میدانِ غزل میں اپنی انفرادیت قائم کئے ہوئے ہے۔اس کی غزل میں لہجے کی مٹھاس، جذبے کی وارفتگی اور لطافت نمایاں طور پر ظہور پذیر ہے۔

اس تشنگی سے ہم ہی تو صحرا نہیں ہوئے
دریا بھی ریت ہو گئے ہیں اب کے پیاس میں

میں اس کی قید سے آزاد ہونا چاہتا ہوں
اسی لئے تو وہ مجھے بار بار باندھتا ہے

دشمن عقب میں آ بھی گیا اور ابھی تلک
تم کو خبر نہیں ہے عصا کون لے گیا

فکر و خیال اور جذبے کے صحیح امتزاج سے ہی خوبصورت شاعری جنم لیتی ہے۔ اسی طرح تخلیقی شعور کے لئے جذبے کو بنیادی عنصر شمار کیا جاتا ہے کیونکہ مشاہدے اور جذبے کی کیفیت ہی ایک ارتعاش کی صورت شاعر کو اظہار پر مجبور کرتی ہے۔ افضل گوہر مشاہدے اور جذبے کی دولت سے بھی مالا مال ہے۔ افضل گوہر کی غزل نئے پیکر و پیراہن میں ڈھلی ہوئی اور جیتی جاگتی زندگی کی ترجمان ہے۔

کبھی زمیں کی کشش سے نکل ہی جاؤں گا
ابھی پروں میں ہے اک آخری اڑان مری
لہروں سے لڑائی کا ہنر سیکھنا ہو گا
تنکا کبھی ہوتا نہیں پتوار مرے یار
تم آئنہ تو بنے ہو مگر خیال رہے
کبھی کبھی کوئی پتھر اچھال دیتا ہے

پیڑ، پرندے، پتھر اور پہاڑ افضل گوہر کی شاعری میں اس بہتاب سے استعمال ہوئے ہیں کہ "بابے" نے اسے انہی مظاہرِ فطرت سے ہمکلام ہونے شرف بخشا ہے۔ حالانکہ اس کی شاعری میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جو ایک عام آدمی کے احساسات وجذبات کی ترجمان شاعری کا لازمی جزو ہوتا ہے:

تمہارا حال تو چہرے سے پڑھ رہا ہوں میں
کسی دلیل سے کیوں اعتبار باندھتا ہے
ذرا سی بات پہ اتنے بھی قہقہے نہ لگا
خوشی کا حد سے گزرنا ملال دیتا ہے

کیا لگائے گا مری ذات پہ قدغن کوئی
بولنا بند سہی، سوچنا آتا ہے مجھے

اس آئنے کی لَو میں کسی کا جمال ہے
چہرہ نہ ڈھانپ اپنی ردا سے چراغ کا

☆......افضل گوہر راؤ کی دوسری کتاب ''تکلم'' پر تاثرات

عہدِ رفتہ کا ایک بابا ......جاوید کرم تبسم

خدا جھوٹ نہ بلوائے یہ مضمون میں نے چلتے چلتے لکھا اور دوڑتے دوڑتے پڑھنے آ گیا ہوں ......ایک دوست سے وقت کی کمیابی اور اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو کہنے لگے ایک شعر بتاتا ہوں تمہید میں پڑھ دینا سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی کہ:

مروت جھوٹ بلواتی ہے اکثر
وگرنہ دوست میں جھوٹا نہیں ہوں

لیکن صاحب مجھے جھوٹ نہیں بولنا اور سچ اگلنا ہے، مجموعی تاثر خواہ کچھ بھی ہو مجھے کچھ کہنا ہے اور میں کیا کہتا ہوں آپ بھی سنیے اور جہاں میں چوکنے لگوں بھرپور داد دے دینا میں چوکنا ہو جاؤں گا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ"......انسان کی ذات کی بنیادوں میں خیر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور بنیادوں سے اوپر جتنی بھی عمارت نظر آتی ہے وہ تمام کی تمام شر سے تعمیر کی گئی ہے۔ کسی عمارت کی بنیادیں نظر نہیں آیا کرتیں لیکن ان میں ہمیشہ مضبوط اور پائیدار میٹریل استعمال کیا جاتا ہے اور اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ساری عمارت کی ساخت اور نقشہ بنیادوں ہی کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ذات میں خواہ کتنا ہی شر نظر آئے یہ تمام کا تمام خیر کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اور اسی طرح بظاہر یہ شر کتنا ہی خودسر کیوں نہ دکھائی دے حقیقت میں خیر کا تابع ہوتا ہے اور اسی کی قائم کی ہوئی لکیر کا فقیر بھی ......

غور وفکر کے ساتھ سامع کا براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ آدمی بغیر سونگھے، بغیر دیکھے، بغیر چکھے اور چھوئے، سوچ سکتا ہے، لیکن بغیر سنے سوچ نہیں سکتا اور بغیر سنے کچھ سوچتا بھی ہے تو اس سوچ کا تعلق ایک خاص سطح سے آگے نہیں جا سکتا، گہرائیوں میں اترنے کی صلاحیت صرف سامعہ کو عطا ہوئی ہے۔ قرآنِ پاک میں بھی ہے" قبول صرف وہی کرتے ہیں جو سنتے ہیں" ...... یہاں قبول کرنے کا فعل واضح کرتا ہے کہ سامعہ کی بدولت ہمیں جو حقیقت خیر کے ہاتھوں حاصل ہوتی

ہے اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی ...... یقین کی تمام منزلیں سامعہ کے بل بوتے پر ہی طے ہوا کرتی ہیں ......'' اب اس تمہید کے بعد میں جو بات کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جاوید کرم تبسم کو میں نے سنا بھی ہے، دیکھا بھی ہے اور پڑھا بھی ہے لہذا مجھے وہ خیر ہی خیر نظر آئے ......حالانکہ ایک دوست نے جب ان کا مجموعہ کلام دیکھا ......اور میرے منہ کے قریب اپنا منہ کر کے (حالانکہ انہیں اپنا منہ میرے کان کے قریب لے جانا چاہیئے تھا) سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا......مزاحیہ ہے؟؟ میں نے کتاب انہیں تھما دی اور ان کی حرکات و سکنات دیکھنے لگا......اور جب انہوں نے کتاب کو کھولا تو اتنے محو ہوئے کہ مجھے ان کی صورت دیکھ کر مزاح کا ایک شدید دورہ پڑا ......بہر حال میں برداشت کر گیا اور اپنا تبصرہ یا فقرہ اپنے اندر ہی اندر جذب کر لیا۔

جاوید کرم تبسم عصری مسائل کو جس تخلیقی شان کے ساتھ سامنے لاتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے ....اس کی نظم ......''غزنوی و غوری تو کب کے رخصت ہو گئے''......غور سے پڑھیں اور محسوس کریں کہ اس میں ہمارے ماضی اور حال مل کر مستقبل کے نئے سوالوں کو جنم دے رہے ہیں۔ یہ ماضی کے ٹمٹماتے چراغ، احساس کے صحرا، شکستِ خواب، سماجی مسائل کے شعور اور حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی شاعری ہے۔ جاوید کرم تبسم معمولی کو غیر معمولی بنانے کے لئے صورتِ واقعہ کو خوبی اور خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ میں اپنے اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے ان کے زیادہ سے زیادہ شعر پڑھ کر آپ کا وقت نہیں لوں گا۔ یہ جتنے بابا نُپ لگتے ہیں ان کی شاعری اتنی بھی قدیم نہیں، تاہم روایت سے انحراف انہیں کسی طور پسند نہیں اور وہ کافی مدت سے لکھ رہے ہیں ......اب تک زیادہ تر ان کی کوشش یہی رہی کہ چھپنے کی بجائے چھپتے رہے ہیں ...... اور ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی کہ:

سفیدی مُو میں کیا آئی پیامِ رفتنی آیا
لپیٹیں بوریا باندھیں کمر آہستہ آہستہ

شاکر کنڈان صاحب کو داد دینا پڑے گی کہ انہوں نے جاوید صاحب کو بوریا بستر لپیٹنے سے پیشتر جالیا۔ جتنی مدت سے جاوید صاحب لکھ رہے ہیں اتنی مدت میں بچہ صاحبِ اولاد ہو جاتا ہے اور صاحبِ اولاد...... لاوارث...... لیکن یہ دھن کے پکے ہیں اور مسلسل لکھے جا رہے ہیں۔ اور ماشااللہ یہ نہ صرف صاحبِ اولاد ہیں بلکہ اپنے بعد یاد کر کے رونے والوں کا ایک قافلہ تیار کر لیا ہے۔ حالانکہ مجھے اپنی ذات کی حد تک اب یہ فیصلہ کرنا پڑ رہا ہے کہ کم از کم شاعری کے میدان سے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنیاد پر resign کر دوں۔

جگہ چھوڑ دوں بیٹے کی خاطر

وہ کل میرے برابر لگ رہا تھا

بات دور چلی گئی......معذرت کے ساتھ دوبارہ جاوید صاحب کی شاعری اور کتاب کی طرف آتے ہیں۔ جاوید کرم تبسم زبان کو آرائشی انداز میں استعمال نہیں کرتے بلکہ حقیقت کے پسِ پردہ ایک اور حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں خیال کی پاکیزگی، جذبے کی شدت، زبان کی صفائی اور محاورے اور روزمرہ کا استعمال بڑی چابکدستی سے کیا گیا ہے۔ اہلِ بیت کی مدحت طرازی اور نوحہ گری کے ساتھ ساتھ صبر و شکر، عزم و استقلال، اخوت و مروت، ایثار و قربانی، عجز و انکسار، حق پرستی و حق گوئی اور بندگی و عبودیت کے مضامین کو فنی مہارت کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے۔ انہوں نے بعض جگہ اصلاحی اور طنزیہ خیالات کا اظہار کر کے معاشرے کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا ہے۔ جاوید کرم تبسم کی غزل میں موضوعات کی رنگا رنگی، خیالات کی پیچیدگی، جذبات کی بے ساختگی اور اسلوب کی وارفتگی نے ایک وسعت اور ہمہ گیری پیدا کی ہے جو فکر کے دھاروں کو نت نئی منزلوں کی طرف لے جاتی ہے۔ ان کا خلاق ذہن ایسی ایسی مضمون آفرینی، فنی نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کرتا ہے جو انہی کا خاصہ ہے۔ گو کہ وہ روایت پرست ہیں اور اپنے ماحول اور تہذیبی رنگ میں رنگے ہوئے بھی ہیں لیکن انہوں نے اپنے گرد و پیش پر بھی بڑی گہری اور عمیق مشاہداتی نظر رکھی ہے۔

وقت کے بارے میں انسانی تصورات ہمیشہ تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ انسان اپنے تہذیبی ارتقاء کے ابتدائی دور میں بھی وقت کے بارے میں کچھ نہ کچھ شعور ضرور رکھتا تھا۔ پھر جب فلسفے کی موشگافیاں شروع ہوئیں تو ایک طرف وقت کے وجود سے ہی انکار کر دیا گیا اور دوسری طرف اسے اکلوتی حقیقت تسلیم کیا گیا اور یوں وقت مقامِ کبریائی تک جا پہنچا۔ مگر ان تمام افکار کے باوجود انسان نے اپنی عملی ضرورت کے لئے وقت کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا یعنی ماضی، حال اور مستقبل ...... پھر ان تینوں تصورات نے خود انسان کے ارتقا میں اپنے نقوش ظاہر کرنے شروع کر دیئے۔ ایک طرف تو وہ ماضی پرست تھا جو ہمیشہ عظمتِ رفتہ کا متلاشی رہتا تھا اور دوسری طرف وہ گروہ ہے جو اپنی تالیفِ قلب کے لئے مستقبل کے واہمے تراشتا ہے۔ اور ایک رومانی رجائیت تشکیل کرتا ہے مگر حال میں رہنے والے بہت کم ہیں، کیونکہ حال ہر لحہ متبدل ہے۔ لیکن شاعری میں اس ساری بحث کی شکل جذباتی سطح پر خاصی تبدیل ہو جاتی ہے۔ ماضی یادِ رفتگان اور مستقبل ...... خواہش اور لحہ جاوداں کی صورت اختیار کرتے ہیں مگر حال لحہ موجود بھی immediate بن جاتا ہے۔ اور مجھے لحۂ موجود کے بارے میں ہی کہنا ہے۔ جس کے بارے میں جاوید کرم تبسم کہتے ہیں

غم ستم کیا ہے کہ خود حال پہ خوشحال ہیں ہم

تم جیو لاکھ برس پھولو پھلو بیٹھو تو

جاوید کرم تبسم اگر تبسم نہ بھی ہوتے تو ان کی شاعری میں ایسا خاصہ مواد موجود ہے جو قاری کو تبسم ریزی بلکہ قہقہہ باری پر اکسا سکتا ہے۔ انہیں یہ ملکہ بھی حاصل ہے کہ وہ الفاظ کو اس مہارت سے استعمال کرتے ہیں کہ وہ گلزارِ معانی نظر آنے لگتا ہے۔ جاوید صاحب کو عروضِ شعر میں خاصی مہارت ہے ورنہ ایسا دعویٰ ہرگز نہ کرتے کہ

عروضِ شعر کا شاید تبسم تھام کر دامن

نکالیں گے معانی کے گہر آہستہ آہستہ

جاوید صاحب کی یہ کتاب پہلی ہے خدانخواستہ آخری ہرگز نہیں، اور عہد رفتہ کے اس بابے کی حوصلہ افزائی اسی میں ہے کہ ہم سب مل کر انہیں اس کتاب کی رونمائی کے موقع پر درازیٔ عمر کی بددعا دیں تا کہ یہ اپنے سارے کام نمٹا کر اگلے جہاں سدھاریں ورنہ کسی کے مرنے کے بعد کون اس کے دیوان چھاپتا ہے...... میں نے تو آج تک بڑے بڑے نامور ''بابوں'' کی وفات پر بھی اخبار میں صرف ایک کالمی سرخی سے زیادہ کچھ نہیں دیکھا۔

....

☆...... جاوید کرم تبسم کی کتاب ''گلہائے تبسم'' کی تقریب رونمائی کے موقع پر ''صدیق آرٹ سروس، راولپنڈی'' میں پڑھا گیا۔ جاوید کرم تبسم صاحب ۲۱ مارچ ۲۰۰۳ء کو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے۔

قیوم طاہر اور ''تلاشِ موسمِ گُل''

قیوم طاہر غزل اور نظم کا مقبول شاعر ہے۔ بہت عرصہ پہلے اس کی ایک کتاب ''لوحِ خزاں'' کے نام سے چھپی جس کے بارے میں محض پڑھا سنا تو ہے لیکن میں نے وہ کتاب ابھی تک پڑھی نہیں اس لئے اس پر رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ تاہم قیوم کی غزل کے بارے میں میری دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ قیوم کی غزل بہت زیادہ پڑھی اور مشاعروں میں سنی بھی ہے۔ قیوم طاہر کا شمار غزل کے حوالے سے معتبر شعراء کے فہرست میں ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے قیوم کی خالصتاً غزل کی کتاب ''تلاشِ موسمِ گل'' منظرِ عام پر آئی۔ جس کی ایک کاپی مجھے بھی ملی۔ میں کسی کتاب پر اس وقت تک نہیں لکھتا جب تک اس کو اپنے خاص نقطۂ نظر سے جانچ پرکھ نہ لوں اور میرا ذاتی زاویۂ نظر دوسروں سے جدا تو ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی انفرادیت میں اتنا بھی ذاتیات کا دخل نہیں کہ میں اسے دوسروں کے ساتھ شیئر نہ کرسکوں۔ دراصل میں کسی بھی ادبی تخلیق کو اس کے مرتب، مصنف یا خالق کی ذاتی حیثیت سے جدا کر کے دیکھتا ہوں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ تخلیق کے باطن میں کتنے فیصد حسن کا پرتو ہے اور اس سے لذت آشنائی کے کون کون سے پہلو مل سکتے ہیں۔ اسی لئے قدرے دیر سے ''تلاشِ موسمِ گل'' پر کچھ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

محض تخیل کی رنگ آمیزی ہی کسی بھی فن کار کے اسلوبِ اظہار کو حسن عطا نہیں کر سکتی بلکہ اس کے لئے تجربے اور احساس کا خلوص بھی درکار ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی فنکار کسی خیال یا کیفیت کو بیان کرنے لگتا ہے تو شعوری کوشش کے بغیر، اس میں اُس کا اپنا تجربہ اور مشاہدہ ضرور شامل ہوتا ہے۔ گویا فن کار کو زندگی کے صحیح شعور اور احساس دونوں میدانوں میں بیک وقت دوڑنا پڑتا ہے۔ اور وہ اسی وقت اپنی صحیح منزل کو پاتا ہے جب وہ ان دونوں پر پوری طرح عبور حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن صرف اسی قدر نہیں کہ کوئی ادب پارہ تخیل اور جذبے کی آمیزش سے جمالیاتی قدر یا حسن کے معیار پر پورا اتر سکتا ہے۔ بلکہ ایسی خصوصیت کو پیدا کرنے کے لئے مواد اور موضوع کی

مناسبت سے الفاظ کا استعمال بھی ضروری ہوتا ہے۔ اور الفاظ کا وافر خزانہ اس کے تخیل میں موجود ہوتا ہے جو کسی داخلی تحریک کے زیر اثر اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر آجاتے ہیں۔ اور ان کو فنکار اپنے خیالات کے اظہار کے لئے منظم طریقے پر ترتیب دیتا ہے۔ یہ ترتیب شدہ خیال یا مواد ہی کسی فنکار کا اسلوب اور انداز بیان کہلاتا ہے۔ صورت و ہیت اسی اسلوب اور انداز بیان کا دوسرا نام ہے۔ اور ہر صنف میں یہی قدر ہے جس سے احساسِ جمال کی تسکین ہوتی ہے۔

اردو غزل زمانے کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھ کر یہاں تک پہنچی ہے۔ اور اس وقت کو بھی اس کا بامِ عروج نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم یہ صنفِ سخن کسی بھی دور میں زوال پذیر بھی نہیں ہوئی۔ بلکہ اس میں بہت سے تجربات ضرور کیے گئے۔ کبھی بے قافیہ ورد یف، اور کبھی آزاد غزل تو کبھی نثری...... لیکن اس کی اپنی روایت اور بنیادیں اتنی مستحکم تھیں کہ جس شدت سے اس کی مخالفت ہوئی اتنی ہی تومندی سے یہ بارآور ہوتی رہی۔

قیوم طاہر نے غزل کے روائتی اسلوب سے ہم آہنگ ہو کر جدت اور ندرتِ فن کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے ہاں خیال، بیان، الفاظ و معنی میں مکمل موزونیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہاں تک کہ اکثر اشعار میں اگر ایک لفظ کا بھی رد و بدل ہو جائے تو شعر کا لطف جاتا رہتا ہے۔ شاعری میں الفاظ میں باہمی توافق، تناسب، موزونی اور ہم آہنگی نہایت ضروری ہوتی ہے۔ تاکہ سب الفاظ مل کر ایک ہی جسم کے اعضاء بن جائیں۔ اسی کا نام سلاست، صفائی اور روانی ہے۔ اور اسی سے شعر میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس خصوصیت کی قیوم طاہر کے ہاں فراوانی ہے۔ قیوم کے متعدد شعرا یسے ہیں جن میں تفصیل و جزئیات اور اشاروں، کنائیون کا امتزاج ملتا ہے۔ وہ شیر و شکر کی طرح گھلے ملے نظر آتے ہیں۔ تفصیل و کنائے کا امتزاج کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

بس ایک آنکھ میں جلوے ہزار رنگوں کے
اور اُس کے بعد ہمیں سب ہُنر چھپانے تھے

سانس لیتا ہے پرانا سا کھنڈر بھی اکثر
سرسراتا ہے کسی سانپ کا سایہ مجھ میں

اس کے ہاں جذبات کا نکھار اتنا ستھرا اور تجربات کی گہرائی اتنی تہہ دار اور وسیع ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے دھندلے دھندلے احساسات کو واضح کر دیتے ہیں کہ وہ اس کی جذباتی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن جاتے ہیں۔ قیوم طاہر کی نفسیاتی اور ایمائی کیفیت اس کا خلوص، شیفتگی، گہرائی اور اتھاہ سپردگی پڑھنے والے کے دماغ کو مسحور کر کے اپنا لیتی ہے۔ اور اس طرح وہ ہمارے ذخیرۂ الفاظ و امثال کا ایک جزو بن جاتا ہے:

تھوڑے سے گیہوں ابھی مٹی پہ رکھے رہنے دو
وہ پرندے کہ کبھی لوٹ کے آنے لگ جائیں
تیری آنکھ میں، میرے ذکر کا بھی تھا رتجگا
کہیں ہجر رُت کا نشان تھا، وہ کہاں گیا

حسنِ کلام کے ارکان میں ندرت اور تازگی بیان کا درجہ بہت بلند ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معمولی خیال بھی حسنِ ادا اور تازگی بیان کی وجہ سے پسندیدہ بن جاتا ہے۔ قیوم طاہر کے ہاں اس قسم کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ ان کے کلام میں خیال کے اظہار میں ایک اُپج اور جدت کا احساس ملتا ہے۔ مضمون آفرینی اور خیال کی بلندی میں بھی قیوم طاہر نے انفرادیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ''تلاشِ موسمِ گل'' میں قیوم کی بلند خیالی کے ایسے نادر نمونے ملتے ہیں کہ بے ساختہ اس کے پروازِ تخیل کو سراہنا پڑتا ہے۔ رمز و کنایہ غزل کی جان ہیں۔ یہی غزل کے شعر مفرد کو تفصیل سے بچا کر اختصار و ایجاز کی منزلوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس سے غزل میں گہرائی پیدا ہوتی ہے:

نہ جانے کون سی راتوں کے شہر میں اترے
چراغ ڈھونڈنے نکلے تھے کارواں میرے

شاعری اظہار کا ایک فن ہے۔ اور قیوم طاہر کا فن اس معیار پر پورا اترتا ہے۔ میرؔ کے نزدیک شاعری باتیں کرنے کے مترادف ہے اور غالبؔ کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ قیوم طاہر نے مکالے کو شاعر کا روپ دیا ہے۔ جس سے شعر کے تیور کچھ اور تیکھے ہو گئے ہیں:

بہت سے خواب کے جیسے جزیروں پر اترتا ہے
کسی بچھڑے کنارے کی کسک بھی ساتھ رکھ لینا
صداؤں سے تہی صحرا میں شاید شام ہو جائے
برستی بارشوں جیسی کھنک بھی ساتھ رکھ لینا

ڈاکٹر سید عبداللہ ''نقدِ میر'' میں لکھتے ہیں ''خلوص وصداقت سے مراد یہ ہے کہ شاعر اور ادیب اپنے تجربات اور جذبات و احساسات کا صحیح صحیح اظہار کرے......شاعری واردات قلبی کی سچی ترجمانی اور زندگی کی صداقتوں کی صحیح تفسیر و تشریح سے عبارت ہے۔ اس وجہ سے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے دل کے سچے جذبے کو بیان کرتا جائے''۔ قیوم طاہر پر بھی جو کچھ گزری ہے اس نے کسی لگی لپٹی کے بغیر اس کا صحیح اور مکمل اظہار کر دیا۔ ان کے ہاں بے ساختگی اور برجستگی کا بھرپور امتزاج ملتا ہے:

یہ اپنے آپ سے بیزار ہو جانے کا موسم
ہم آئندہ کا جیسے باب ہوتے جا رہے ہیں
آنے والو! نہ دلیلیں نہ حوالے مانگو
ہم نے دیمک سے کتابوں کو بچایا ہی نہیں
زندگی ایسے نہیں کٹتی ہے
زندگی کرنے کا ڈھب ہوتا ہے

قیوم طاہر کے ہاں سادگی، پُرکاری اور سلاستِ بیان کا ہنر ملتا ہے۔ جس سے ان کے

فن میں بے ساختگی اور برجستگی ملتی ہے۔اس کے ہاں محاکاتی اسلوب بھی ملتا ہے۔جس سے اس کے شعروں میں زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں متحرک نظر آتی ہیں۔تصویر کے خدوخال اس کے اشعار میں اس درجہ واضح ہوتے ہیں کہ کوئی مصور کسی کاغذ پر تو کیا کوئی عکاس اسے فوٹوگراف کی مدد سے بھی شاید ہماری آنکھوں کے سامنے نہ لا سکے:

صوفوں پر جب اک بیزاری دھول بکھیرے
مہکا کمرہ بھی زنداں سا ہو سکتا ہے
بے معنی سی باتوں کا ریشم بنتے ہو
تم نے بھی یہ تانا بانا سیکھ لیا ہے
یونہی تو گھر کی ساری کھڑکیاں کھولی نہیں میں نے
دیا بھی آزمانا ہے ہوا بھی آزمانی ہے

قیوم طاہر کی غزل کا ایک بڑا موضوع انسان اور انسانی تعلقات ہیں۔یوں یہ شاعری زندگی اور اس کے تجربات سے عبارت ہے۔قیوم طاہر کی شاعری سچی،کھری اور حقیقی انسانی اقدار کی امین ہے۔اس کی شاعری میں ہمارے معاشرے کے منافقانہ رویّوں کے خلاف احتجاج بھی ہے اور سماج میں منہ پر تعریف اور پیٹھ پیچھے بُرائی کا جو رواج ہو گیا ہے اس کے خلاف ردِ عمل بھی ملتا ہے:

راکھ پر سجاتے ہیں پھول جیسے لفظوں کو
نقش جو بناتے ہیں رائیگاں بناتے ہیں
اپنے چہرے پہ کبھی خاک وطن بھی ملتے
آپ بس دور کا مہتاب لئے پھرتے ہیں
اُجلے لوگوں سے ملنا کتنے دھوکے دیتا ہے
گرہیں کھل کھل جاتی ہیں اور خول اترتے جاتے ہیں

ان کی غزل میں سیاسی شعور کی فراوانی ہے۔ وہ ایک بیدار مغز اور اظہار رائے کی آزادی کا داعی شاعر ہے۔ ۱۹۷۱ء کے سانحے کو وہ کچھ اس انداز میں بیان کرتا ہے:

جو میرے بخت میں چودہ اگست لکھا تھا
کہاں سے سولہ دسمبر سا پھر زوال آیا

سیاسی منظر نامے کا اتار چڑھاؤ زندگی کے لہو میں کبھی تو ایسی روانی پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے ہر مسام سے خون ابلنے لگتا ہے اور کبھی ان رگوں کا خون ایسا جمتا ہے کہ ہر مسام سے پھوٹ کر نکلتا ہے۔ اور بظاہر چلتی پھرتی ...... آگے بڑھتی زندگی ادھموئی ہو کر سسک سسک کر آگے بڑھتی ہے۔ اس کی دھڑکنوں اور نبضوں کی آوازوں میں ایسی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے کہ جینے والوں کو اس کے جینے کی آس تک نہیں رہتی۔ انہی کیفیات و احساسات کا اظہار قیوم طاہر کے اشعار میں ملتا ہے۔ وہ کبھی خفا ہو، کبھی رو رو کر اور کبھی کربناک کراہ کی صورت میں ایسی آواز نکالتا ہے کہ جس سے درد کی ٹیسیں کچھ اور اذیت ناک ہو جاتی ہیں:

اب وہی شہر میرا نام و نسب پوچھتا ہے
جس کی گلیوں کا، در و بام کا محبوب رہا
لبوں پہ قفل ڈال کے وہ کنجیاں چھپا گیا
سماعتوں پہ زنگ ہے صدا کے انتظار میں
یہ پوری نسل صحرا میں بھٹکنے سے تو بچ جاتی
تمہیں کچھ چھاؤں کی خاطر مرے اجداد کرنا تھا
اب پوچھتے ہو چڑیوں کی ہجرت کا کس لئے
بھورا بھی ایک تھال میں رہنے نہیں دیا

اس دور میں انسان زندگی کی تلخ کاریوں سے تنگ آ کر، اس کی چہل پہل سے دور، تنہائی اور بے چارگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اور اس تنہائی میں کسی ایک چیز یا ایک

خیال کو اپنا مونس و ہمدم بنا کر اسی ایک سہارے پر زندگی کے بہاؤ کے ساتھ بہتے چلے جانا چاہتا ہے۔ اگر اس کا حال احوال پوچھا جائے تو وہ یوں کراہتا ہے:

تجھے کیا ملے گا کرید کر، یہاں ایک رنگ ہے راکھ کا
مجھے موسموں نے جلا دیا، میرے پاس تازہ گلاب تھے

اس چڑھائی پر تو سانسوں کو اکھڑ جانا ہی تھا
ساتھ دیتا بھی کہاں تک حوصلہ مانگا ہوا

قیوم طاہر نئے امکانات کا نمائندہ شاعر ہے۔ اس نے ''تلاشِ موسمِ گل'' میں ادب کے قاری کو ایسی زندہ، بھرپور اور تازہ شاعری دی ہے کہ جو کم از کم اگلی صدی تک انتہائی تیزی سے بدلتے رویوں اور ضرورتوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہے گی۔

آصف ثاقب......روایت اور جدت کا حسین امتزاج

شاعری کے اُفق پر ہمارے کائناتی آفاق کی طرح وسیع و بسیط نہیں تاہم حیات و کائنات کی پردہ کشائی اور اس کے ایک چھوٹے سے کرّے میں آباد انسان اور اس کی دُنیا کے تہہ در تہہ رازہائے سربستہ کو منکشف کرنے کا فریضہ اور اس کے ظاہر و باطن کو وسیع تناظر میں پیش کرنے کا جوکھم اپنے نمود سے ہی اٹھائے ہوئے ہے۔ کائناتی آفاق کی طرح یہاں بھی اہلِ نظر طلوع اور زوال کے منظر نامے کا مشاہدہ دِل کی آنکھ سے کر سکتے ہیں۔ اس اُفق پر بھی سینکڑوں ستارے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ کہکشاں کی شکل میں جبینِ ادب کے ماتھے کا جھومر بن جاتے ہیں تو کچھ اپنی طویل تر مہارت نور کے باوصف مثلِ آفتاب ایک الگ دُنیا کی تشکیل کرتے ہیں ......ایک نئی تخلیقی کائنات! اور اس طرح دیگر سیارگانِ ادب اس آفتاب کی گردش میں منہمک ہو جاتے ہیں تا دیر کوئی اور اس کی تابانیوں اور کشش کے ماسوا نمودار نہیں ہو جاتا۔ ہر صدی ایسی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ادب کے شائقین ادب کے آسمان پر نگاہیں جمائے رنگ و نور کے نئے قافلے کے منتظر رہتے ہیں۔

شعر و ادب اور سرزمیں ہزارہ ایک ایسا مضبوط حوالہ ہے کہ جس کے بغیر تاریخ ادب مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے میری بدقسمتی کہیے یا کم آمیزی کہ ایبٹ آباد شہر سے کم و بیش تیس سال کی وابستگی کے باوجود میں آصف ثاقب سے بالمشافہ ملاقات کی سعادت سے محروم رہا ہوں لیکن شعر و ادب کا ایک حقیر طالب علم ہونے کی حیثیت سے میری آصف ثاقب سے برسوں پہلے کی شناسائی ہے۔ آصف ثاقب کے ہزاروں مداحوں میں سے ایک ممتاز شیدائی زُہیر کنجاہی بھی ہے۔ زُہیر کنجاہی کے ہاں جب بھی نیازمندانہ حاضری کا موقع ملا اس نے ''بوئی والا بابا'' کا ذکر انتہائی محبت

سے کیا۔ مجھے پہروں بیٹھ کر زُہیر کنجاہی کی زبانی آصف ثاقب کے شعروں سے لطف اندوز ہونے کے مواقع میسر آئے جو میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ یوں آصف ثاقب کی شاعری غیر شعوری طور پر میرے مطالعے کا مرکز و محور بنی۔ صفِ اول کے تقریباً تمام رسائل و جرائد میں آصف ثاقب جلوہ آراء ہوتا ہے اور وہ اکثر شعر کا روپ دھار کر میری فکری شیرازہ بندی کا فریضہ بھی سرانجام دیتا ہے۔ میں اس کے شعر کے بجائے اس کی تنقیدی بصیرت اور شعر و ادب سے بےلوث کمٹمنٹ کا مداح ہوں۔ خیر یہ باتیں تو میری ذات اور اس کی آصف ثاقب سے وابستگی کی کتھا ہے۔ سرِ دست تو مجھے ان کے مجموعے ''در کنار'' کے حوالے سے آصف ثاقب کی دریافت کا مرحلہ درپیش ہے۔

لفظ انسانی تہذیب کا سرمایہ بھی ہے اور فکری نظریات کی پہچان بھی ...... میں سمجھتا ہوں کہ زمین پر سب سے پہلے انسان کا اولین معجزہ لفظ کی تخلیق تھا۔ جس نے اسے خود اسے خود سے آشنا ہو کر اپنے آپ کو متعارف کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ لفظ ہماری کائنات ہیں، لفظ ہمارے ادراک کا مؤثر ذریعہ ہیں اور ہمارے محسوسات کے اظہار کا توانا وسیلہ بھی ہیں۔ لفظ کی اس قوت سے انہوں نے ایک نئی دنیا کے کواڑ کھولے ہیں۔ اس نئی کائنات کی بابت انہوں نے یوں اطلاع دی ہے۔

کسی تحریر میں ایسی محبت آ نہیں سکتی
مرے دل کے سیہ کاغذ پہ لفظ ''انسان'' لکھا ہے
غموں کی شعر میں تجسیم ہوتی رہتی ہے
لہو کے رنگ سے پیکر سنورتے رہتے ہیں

سچل سرمست کہتے ہیں'' جب منصور خون میں نہایا ہوا تھا ...... ایک مجذوب آیا اور کہنے لگا، خوش ہو جا اور حق کے راز کو پوشیدہ رکھ ...... منصور کا سر مجذوب کی جانب گھوما اور ہنس کر کہا ...... دریا کوزے کے اندر کہاں چھپ سکتا ہے؟ '' ...... آصف ثاقب بھی ایک ایسا دریا ہے جو واردات، تجربے اور خیال کی پختگی میں بکھراں ہے۔ جس کی وسعتیں اور لہروں کی روانی اپنے اندر فکر و خیال کے ایسے گوہر سمیٹے ہوئے ہیں جن تک رسائی اور جن کی تفہیم کے لئے برسوں کی

ریاضت درکار ہے۔ اٹھارویں صدی کی نو کلاسیکی اقدار کے آخری نمائندے ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا...... ''ذکاوت (Wit) کے لئے شرط یہ ہے کہ بات کو نئے سرے سے سوچا جائے''۔ گویا وہ صرف معلوم پر یقین نہیں رکھتا تھا بلکہ پوشیدہ گوشوں کی رونمائی کو ذکاوت کہتا تھا۔ غالب کے ہاں یہ چیز بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شاعری کا تناظر تصوف کی مجہولیت، تقدیر پرستی اور فارسی صوفیانہ تجربات تک محدود تھا۔ وید کا فلسفہ اور روحانی جذبہ بھی کہیں کہیں ہلکی سی جھلک دکھاتا تھا۔ غالب نے اپنے عہد کی بیاض سے رینگتے لفظ چننے کی بجائے ٹھہری ساعتوں کی حدود توڑ کر ارتقائی اور تخلیقی خیال اور زبان کو شاعری کا ماخذ بنایا۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

یہی وجہ ہے کہ اتنی مدت گزر گئی مگر غالب ہے کہ ادب کی فضائے بسیط پر ویسے کا ویسا غالب ہے۔

پرانے لفظ اتر آئے ہیں بغاوت پر
غریب طفل کا بستہ بدلنے والا ہے

آصف ثاقب کا مجموعہ ''درکنار'' دراصل ہست پر نظرِ بازگشت ہے یہی وجہ ہے کہ مجھے آصف ثاقب کی غزلیات پر بات کرنے کے لئے ڈاکٹر جانسن کے نظریۂ ذکاوت کا سہارا لینا پڑا ہے۔ غالب نے شعر کی زبان میں جو کچھ کہا وہ بھی دراصل موجودہ کا نئے سرے سے جائزہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ غالب کا اندازِ بیاں اور ٹھہرا۔

بات کہنی ہے مگر دیکھ کے کہنی ہو گی
شاعری اب سرِ بازار نکل آئی ہے

آصف ثاقب نے بیتے عہد کو نئے عہد میں اترتے دیکھا ہے۔ وہ غزل کی کلاسیکی روایت سے بھی آگاہ ہے اور رومانی روایت سے بھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ عہدِ جدید کے کرب

میں ڈوبے لمحوں میں ایک حساس فرد کی طرح اپنے قدموں پر کھڑا ہے۔اس نے کلاسیکی روایت کو ٹوٹتے دیکھا ہے، رومانویت کے حسین چہرے پر وقت کے خونخوار پنجوں کی خراشوں کا مشاہدہ کیا ہے مگر وقت کے اس منہ زور ریلے میں اس نے خود کو بہنے نہیں دیا۔ کلاسیک اور رومان کے چپوار اس کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ مسلسل وقت کی منہ زور لہروں سے نبرد آزما ہے۔اس کی صدائیں اس قابل نہیں کہ ان سُنی رہ جائیں۔ابھی کلاسیک اور رومان کے تخم ثمر آور میں نمو کا امکان بھر پور صلاحیتوں کے ساتھ موجود ہے اور اجتماعی طور پر اس کی شاعری روایت اور جدت کا ایک حسین امتزاج ہے۔لہٰذا آصف ثاقب کی صدا پر کان دھرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

پھر آنے والا ہے مجھ کو خیال جگنو کا
شریک غم وہی بجھتے دیئے سے پہلے تھا

رومان اور کلاسیک یعنی روایت سے جڑے رہنے کا یہ مطلب نہیں کہ آصف ثاقب نے عہد حاضر کے آشوب کو قطعاً اہمیت نہیں دی۔ وہ اس عہد میں جی رہا ہے اور ماحول کی آلودگی جب اس کے تنفس میں مزاحم ہوتی ہے تو بے اختیار اس کے لب کھل جاتے ہیں مگر ایسے بے اختیار لمحوں میں بھی وہ اپنے خیال کو حسین لفظی تراکیب کی روشنی سے منور کرتا ہے۔

رواج نکلا ہے ذلت پہ جشن کرنے کا
ہر احتجاج کا الزام میرے سر آیا
ایک آنسو کے سوا کیا ہے سحر کے اندر
ایک سسکی کے سوا شام کیا رکھا ہے
مرا پڑاؤ ہے پھر دشمنوں کے گھیرے میں
پھر ایک سجدہ ہو اور کربلا کا منظر ہو

اقبال نے کہا تھا کہ ”فلسفہ بوڑھا بنا دیتا ہے اور شاعری تجدید شباب کرتی ہے“...... درست ہی تو کہا تھا......آصف ثاقب نرا فلسفی ہے نہ محض عقلیہ اور ایسا بھی نہیں کہ صرف شاعر ہو کہ

''سنا ہے''اور''بات کر کے دیکھتے ہیں'' کے بیچ الجھار ہے۔آصف ثاقب نہ بوڑھا دکھنا چاہتا ہے اور نہ کل کے چھوکروں جیسی عقل کی کسوٹی پر کھری نہ ثابت ہونے والی حرکتیں کرتا ہے۔اس میں ایک وسعت ہے سمندر جیسی مگر ساحل کی لکیروں کے بیچ......ایک بہاؤ ہے ندی جیسا مگر پھیلے کناروں کے اندر اسی کے اِدھر اُدھر کہیں آصف ثاقب کا بیچ ہے......دو شعر دیکھیں:

پناہ لینے کو آتی ہے میری کٹیا میں
خبر نہیں یہ ہَوا کس کے ڈر سے آتی ہے

سفینے باندھ کے رکھتا ہوں دریچوں سے
کہ میرے صحن سے دریا گزرتے رہتے ہیں

آخر میں ایک ناگفتنی کہ اگر آصف ثاقب کے سرمایۂ شعری کا انتخاب کرتے وقت تھوڑی سی اور محنت کر لی جاتی تو ''در کنار'' سے بہت بہتر بلکہ اعلیٰ درجے کی شاعری پڑھنے کو ملتی۔نجانے انتخاب کرتے وقت انہوں نے سہل پسندی کا ثبوت کیوں دیا۔میرے خیال میں اس وقت بھی ان کی وہی درویشانہ طبیعت اپنی جولانی پر ہوگی جس کا مظاہرہ اکثر سننے کو ملتا ہے۔

شہرت کی چاندنی میں نہایا ہوا وہ شخص ...... پرویز ساحر

ہیری ایمرسن فاسڈک (Harry Emerson Fosdick) لکھتا ہے::

No steam or gas ever drives anything until it is confined. No niagra is ever turned into light and power until it is tunnelled. No life ever grows until it is focussed, dedicated, disciplined.

اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک بھاپ یا گیس کو مقید نہ کر دیا جائے وہ کسی شے کو چلانے کی اہل نہیں ہوتی۔ نیاگرا کو جب سرنگ میں سے گزارا گیا تب ہی ان نے روشنی اور توانائی پیدا کی۔ انسانی نفس بھی تب ہی ترقی کے مدارج طے کر سکتا ہے جب منظم اور مربوط طریقے سے اس کا صحیح رخ متعین کیا جائے۔ یہ مثال ہر حوالے سے پرویز ساحر پر پوری اترتی ہے۔ اس کے سامنے منزل بھی ہے اور نظم بھی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ سرنگ سے گزرنے یا مقید ہونے کی سختی بھی برداشت کر سکتا ہے۔

ایک پتھر کی طرح در پہ پڑا ہوں تیرے
تُو مجھے پیار سے چھو لے تو میں کومل ہو جاؤں

غزل میں جب ہم قدیم روایت کی بات کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم روایات نے جدید تہذیبی عناصر کو نہ صرف قبول کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیا ہے بلکہ نئے موضوعات کو بھی نئی لفظیات اور نئے لہجے اظہار کے ساتھ بڑی خوشی سے اپنے اندر جگہ دی ہے اور جمالیاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ تازگیِ خیال اور محسوساتی فضا کو جذب بھی کیا ہے۔ محاسنِ تغزل اور اسالیبِ فکر سے آراستہ غزل کہنے والے شعراء میں ایک نام پرویز ساحر کا بھی ہے کیونکہ قدیم و جدید روّیوں کے ساتھ ساتھ اس شاعر نے اپنی امنگوں، آرزوؤں اور مشاہدات کو شگفتگی اور ایک آہنگ سے پیش کیا ہے۔ وہ ان معنوں میں خوش قسمت ہے کہ جہاں اسے ہجر کی تیکھی دھوپ سے

آشنا ہونا پڑا ہے وہیں وصل کی آبشار میں بھیگتے رہنے کے عمل نے اسے سیراب وشاداب بھی کر رکھا ہے۔ اس رویئے کا ایک منطقی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس کے لہجے میں تلخ موضوعات کو بیان کرتے ہوئے بھی تلخی یا کھردرا پن نہیں اور وہ اپنے مزاج میں ایک درویشانہ آہنگ کی تفسیر نظر آنے لگتا ہے۔

وہ کسی موجِ آب جُو میں کہاں
میرے اشکوں میں جو روانی ہے
مدتوں آتشِ ہجراں میں جلا
تب کہیں دید کے قابل ہوا میں
جدھر دیکھئے، ہے وہی چار سُو
ہر اک شے میں جلوہ نما عشق ہے
یہ اور بات کہ خود کو گنوا دیا میں نے
مگر یہ کم ہے کہ ہاتھ آ گیا خزینۂ عشق

پرویز ساحر کی شاعری کا بنیادی منطقہ ۔۔۔ جمالیاتی فکر کا ایک ایسا احساس ہے جس کا رشتہ مٹی سے منسلک ہے اور یہ مٹی ایک استعارے کے طور پر پوری کائنات کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ انفرادی محور پر چلتے رہنے کے باوصف اجتماعی دائرے کی محسوساتی کرشمہ سازی کا اسیر رہتا ہے اور جب اپنے اندر کی فضاؤں میں سانس لیتا ہے تو وہیں سے اس کے ظرف کی آزمائش شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اس کے شعری تلازموں کی لسانی تشکیل کا آہنگ بڑا اہم حوالہ بنتا ہے اور یہیں سے ڈکشن اور اسلوب کی سطحیں، نفسیاتی تجزیوں کا جواز بنتی ہیں۔

سب سے آنکھیں چرائے پھرتا ہوں
میری آنکھوں میں تیری صورت ہے

پرویز ساحر کی شعری لغت میں گل، خوشبو، چاندنی، جمال، ستارہ، ہجر، وصال، چشم و

لب، آنکھیں، درویش، فقیری، خواب، تعبیر، عشق و مستی، محبت، دوستی اور روشنی اس کی غیر شعوری انسان دوستی کا انداز بنتا ہے اور یہ انسان دوستی جب رجائیت کے پیمانے میں اپنی پہچان کے در یچے کھولتی ہے تو اس سے انسانیت کی بقا آشکار ہونے لگتی ہے۔ اس کے موضوعات میں غیر شعوری طور پر خودنرگسیت کا عنصر بھی ملتا ہے لیکن یہ عنصر پریشان خیالی کا غماز نہیں بلکہ ایک وسیع تناظر میں انسان اور انسانیت کی ذہنی، فکری اور جمالیاتی اٹھان سے ہم آہنگ ہے۔

رقصِ درویش بپا ہے مجھ میں
کوئی مجھ سے بھی سوا ہے مجھ میں

وہ طبعاً شریف النفس اور انتہائی ہوشمند نوجوان ہے۔ محبت سے لبریز اور دردمند دل رکھتا ہے۔ حسن و جمال کی شستہ اور شائستہ قدروں سے خاص تعلق خاطر ہے۔ اس کی غزل دل کے دریدہ دامن میں شعلوں کے پھولوں کی لب بستہ پکار ہے۔ جلتی بجھتی کیفیتیں لفظوں میں ڈھل گئی ہیں۔ حالات کے دوزخ میں چاہتوں کی جلتی ہوئی جنت اس کی غزل میں سکون تلاش کر رہی ہے۔

بس یہی کرن مجھے کافی ہے
اپنے ہونے سے خبردار ہوں میں

رشتۂ جاں کی طرح اُس کو میں رکھوں گا عزیز
گر مرے ہاتھ تری زلف کا مُو آئے

بعض احباب چھٹتے ہی پرویز ساحرؔ پر زود گوئی اور بسیار نویسی کی پھبتی کس دیتے ہیں گویا زود گوئی اور بسیار نویسی ایک بہت بڑا عیب ہے۔ عیب جوئی کا یہ فریضہ وہ لوگ با جماعت ہو کر ادا کرتے ہیں جو دو چار مصرعے کہنے کے بعد بری طرح ہانپنے لگتے ہیں۔ انہیں نہ کوئی خیال سوجھتا ہے اور نہ ترکیب۔ دو چار اشعار یا چار چھ غزلوں کا پلندہ لے کر نامی گرامی شعراء کی اگلی صف میں گھس جانے والوں کے اس بازار میں اگر کوئی گلیم پوش جاں فروشی پر اتر آئے تو انہیں اپنے جبہ و

دستار کو بچانے کی فکر پڑ جاتی ہے۔حواس باختگی میں وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔پرویز ساحر غزل کے بے کنار ساحلوں پر کھڑا رنگ رنگ کے شعر دیکھتا ہے کچھ صدیوں پرانے اور کچھ نئے زمانوں کے مگر جب وہ اپنے اشعار کی نرسری سے چند اشعار لاکر یہاں لگاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اشعار کے رنگ نئے نویلے بھی ہیں اور ان کی مہکاریں دور دور تک محسوس کی جا رہی ہیں۔وہ ظاہری جمال کا حامی تو ہے ہی مگر باطنی خوبصورتی بھی اس کی نظر میں رہتی ہے:

جمالِ ظاہری بھی ہے بجا لیکن
جمالِ باطنی بھی تو حقیقت ہے

ایک اور اعتراض یہ سننے میں آتا ہے کہ اس کی شاعری میں سرقہ،توارد اور نامی گرامی شعراء کی زمینوں کی اندھی تقلید نظر آتی ہے۔اس باب میں اتنا عرض کرنا ہے کہ ایسی پھبتی کسنے والے احباب رومی، حافظ اور اقبال کا دقتِ نظر سے مطالعہ کریں تو ان پر یہ راز بھی عیاں ہو جائے گا۔ان تینوں آفاقی شعراء کے ہاں ایک آدھ لفظ یا ترکیب کی تبدیلی سے شعر کہنے کی بیسیوں مثالیں ملیں گی۔ان پر وہ ایسا الزام لگانے کی جرأت بھی کریں تو مزہ آئے۔یہ الزام اس لئے بھی نہیں آیا کہ رومی، اقبال یا حافظ کی فکری مماثلتوں پر کبھی جم کر اور ڈھنگ سے کسی نے کام ہی نہیں کیا۔ایک لفظ، خیال یا ترکیب ہر ایک کو سوجھ سکتا ہے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اس لفظ، خیال یا ترکیب کو کس انداز میں پیش کیا ہے۔لفظ ''محبت'' کو لیں تو اس کی معنویت آشکارا کرنے کے لئے سو سو خیال سوجھتے ہیں لیکن ترکیب و استعارے کا برجستہ استعمال ہی شعر کو زمین سے آسمان کی بلندی پر پہنچا سکتا ہے۔اس فن میں اگر کوئی طاق ہے تو اسے داد دینے کے بجائے کوسنے کیوں دیئے جاتے ہیں۔

پہنچا ہے میرا عشق اب اوجِ کمال پر
اُس کی شبیہہ بن گئی لوحِ خیال پر

میرے خیال میں ایسے ہی نام نہاد نقادوں کی تنقید سے بد دل ہو کر پرویز ساحر نے

گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ مگر وہ اپنی منزل پر نگاہ جمائے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ جانفشانی اور ریاضت کے ساتھ اپنے ہدف کی طرف نہ صرف تیزی سے بڑھ رہا ہے بلکہ کسی حد تک اس راہ کے تمام کانٹے چن چکا ہے۔ اب اس کے سامنے خوشبوؤں سے مہکتا ایک چمن زار ہے اور اس چمن زار میں اس کی خوش خرامی ایک دلفریب منظر پیش کر رہی ہے۔

عالمِ ممکنات تک، ذات سے کائنات تک
میں نے یہ سارا فاصلہ، طے کیا ایک جست میں

اس کی پہلی کتاب نے بڑے بڑے برج گرائے، بہتوں کو حیرت زدہ کیا اور بے شمار مداح پیدا کیے۔ اگلے آٹھ سالوں میں اوپر تلے چھ کتابیں شائع ہوئیں۔ اس دورانیے میں اردو دُنیا کا ایک بھی ایسا قابلِ ذکر ادبی مجلہ اٹھا کر دیکھ لیں پرویز ساحرؔ ضرور جلوہ افروز ملے گا۔ اس کی شہرت اب پاکستان کی سرحدیں عبور کر چکی ہے۔ جس طرح شاعر کے بارے میں لطیفہ سننے میں آتا ہے کہ ’’اُسے دال روٹی ملے نہ ملے وہ داد کا طلبگار رہتا ہے‘‘، اسی طرح ہر شاعر، ادیب اور اہل قلم کی سب سے بڑی تحسین یہ ہوتی ہے کہ اس کا لکھا ہوا لفظ پڑھا جائے۔ پرویز ساحرؔ کو اس تحسین کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی اعزاز ملا ہے کہ اب لوگ اس کی اگلی کتاب کا انتظار کرتے ہیں۔ اس کے نکتہ چیں اس معاملے میں زیادہ بے صبرے دکھائی دیتے ہیں۔

مطبوعہ: روزنامہ ’’شملہ‘‘ ایبٹ آباد (بروز منگل مورخہ: جولائی ۲۰۱۰ء)

{بزمِ اہلِ قلم نواں شہر کے زیرِ اہتمام پرویز ساحر کے چوتھے مجموعہ کلام "آواز کا چہرہ" کی تقریبِ رونمائی (مورخہ ۲۱ جولائی ۲۰۱۰ء) کے موقع پر میری غیر حاضری میں عزیزی کاشف بٹ نے پڑھا}

سعد اللہ سورج اور "سورج کی پہلی کرن"

سعد اللہ سورج آسمانِ شاعری کا ایک ایسا درخشاں ستارہ ہے جس کے حصے میں دن کا سفر زیادہ آیا ہے لیکن اس نے اکثر روشنی کے جھماکے کئے ہیں اور تیز اُجالوں میں بھی اپنے وجود کا احساس دلاتا اور اپنی کرنوں سے ظلمتِ عالم میں شگاف ڈالتا رہا ہے۔ اس نے لفظوں سے ساحری بھی کی ہے اور شاعری کے آنگن میں حسنِ بیان کے خوش رنگ پھول بھی کھلائے ہیں۔

مفت دنیا میں کچھ نہیں ملتا　　　　پیار دیتا ہوں، پیار لیتا ہوں

سعد اللہ سورج کو شاعری مرغوب ہے اور شاید شاعری بھی ایسے ہی دیوانوں کی متلاشی ہوتی ہے جو اس سے بے غرض تعلق اور شوق مستانہ رکھے۔ اسے سکے میں نہ ڈھالے یعنی سکہ بند خیالات کی ترجمانی کا وسیلہ بنائے بلکہ اپنے تخلیقی امکانات کو اس کے آئینے میں سجتا، سنورتا دیکھے اور اسے تکملیت کے مراحل طے کرنے کی سمت گامزن کردے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ سعد اللہ سورج نے شاعری سے کچھ ایسی ہی نوعیت کا تعلقِ بے ریا اور خالص فنکارانہ رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اپنی تعلیمی مصروفیات سے وقت بچا بچا کر اُس نے اُردو شاعری کے خواب دیکھنے اور تخیل کی مشق سے خود کو غافل نہیں رکھا۔ اس مشق نے اُس کی طبیعت کو روانی، قلم کو جولانی اور آنکھوں کو اعلیٰ معیار کا متلاشی بنا دیا۔

چھوڑ کر دولتِ سکوں، شاعر
غم کے موتی جہاں سے چنتا ہے
خون انساں کا بہت دور، کہ شاعر کا دل
خون چڑیا کا بھی دیکھے تو دہل جاتا ہے

سعد اللہ سورج کی شاعری محض واقعہ کا بیان نہیں اسے جھیلنے کا بھی نام ہے۔اس طرح شاعر اپنے اردگرد کی دنیا اور اس کے معمولات سے ہم رشتہ نظر آتا ہے۔اس کے مسائل، رنج و کلفت، سرخوشی اور سرکشی سبھی کچھ اس کے تجربات کا حصہ اور تخلیقی عمل کے نادر ترین لمحات میں قالب شعر میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔اس کے دل کا کرب کاغذ پر اتر آتا ہے۔

یوں تو دل نے بھی تجھے ہنستے ہوئے رخصت کیا
پر ترے جاتے ہی دل نے جو کیا کیسے کہوں
ہر انساں کو عطا ہوتا نہیں ذوقِ مسیحائی
وگرنہ درد اوروں کا سبھی محسوس کرتے ہیں
تمہیں کربِ شاعر کا احساس ہو گا
ذرا سوچنا تم حقیقت سے آگے
تشنگی، سانحے، درد اور حسرتیں
ہیں ضروری بہت شاعری کے لئے
جب آشنائے لذتِ آزار ہم ہوئے
تب جا کے یار! صاحبِ کردار ہم ہوئے

بلاشک ان اشعار میں شاعر نے جن واقعات یا عوامل کی نشاندھی کی ہے وہ یقیناً اس کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ عوامل اس قدر پوشیدہ ہیں کہ شعر کی معنویت کو نئی جہتیں بھی عطا کرتے ہیں۔ٹھیک اسی اسکیچ کی طرح جو رنگوں سے خالی ہے اور اب جس کی انگلیاں جس قدر ریشم اور رنگوں کی زبان سمجھتی ہیں تصویر کو اسی صورت مکمل کر لے۔شاعری میں فلسفے کا شدید الجھاؤ میرے نزدیک ایک ذہنی ورزش کے سوا کچھ نہیں۔چند موٹی باتوں پر گھنٹوں آنکھیں موند کر خلیج پاٹنا ذہن کو خشک بنا دیتا ہے اور لطافت و نرمی کی جگہ

چہرے کی کرختگی کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ مسرت تو کیا کسی ایسی کیفیت سے بھی نا آشنا رہ جاتے ہیں جو کم از کم پیشانی پر ابھری ہوئی موٹی رگوں میں دورانِ خون کم کر دے۔

آدمی زندہ ہے لیکن
جو تھا انساں مر گیا ہے
جسے انسان مالک نے بنایا
مجھے پتھر دکھائی دے رہا ہے
تہذیبِ دورِ حاضر کی روشنی نے سورج
اندر سے آدمی کو بے نور کر دیا ہے

محولہ بالا اشعار کے مضامین، لفظیات کا انتخاب اور طرزِ بیاں اس بات کے مظہر ہیں کہ شاعر اپنے عہد کا نوحہ لکھ رہا ہے۔ انسانی قدروں کی پامالی کا نوحہ! تاہم اس کی مایوس آنکھوں میں بے شمار چراغ جل رہے ہیں۔ تشکیک کی وادیوں میں بھی ایقان کے چراغ جلانے والوں میں ہی اسے انسانِ کامل کی تلاش اور ایسے ایسے آدمِ نو کا انتظار ہے جس کی منزل خلاؤں سے کہیں آگے ہے۔

اب کوئی فرشتہ تو نہ بانٹے گا مرا دُکھ
آ! تھام لے انسان ہی انساں کے لئے ہے

....

☆...... سعد اللہ سورج کی پہلی کتاب "سورج کی پہلی کرن" پر تاثرات

رہِ عشق و محبت کا مسافر......محمد یعقوب فردوسی

انسان کی عظمت کو ترازو میں نہ تولو

انسان تو ہر دور میں انمول رہا ہے

محمد یعقوب فردوسی ایک ایسا قلم کار ہے جو محض اپنے شوق کی خاطر اور تسکینِ قلب و نظر کے لئے مسلسل لکھے جا رہا ہے۔ اسے اس سے سرکار نہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ وہ جو کہنا چاہتا ہے اس کا برملا اظہار اس کا متمعِ نظر ہے۔ ادب کی مختلف اصناف میں اور مختلف حیثیتوں سے اپنا حصہ ڈالنا کسی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے اور وہ اپنے حصے کا قرض اتارنے کی سعیِ مسلسل میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس کے کام اور فن کا تعین تو کوئی محقق یا نقاد ہی کر سکتا ہے۔ اسے کسی تحسین کی تمنا یا پرواہ بھی نہیں۔ وہ تو محبت کا پیامبر ہے اور محبت بانٹنے میں مصروف ہے۔ اس کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہے وہ اس کا جذبہ و خلوص ہے جو یقیناً اعلیٰ اخلاق ہی کی پیداوار ہوتا ہے اور یہی خلوص اعلیٰ شعری روایات کی جان ہوتا ہے کہ جس کے بغیر شعر میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایسا لگتا ہے کہ اسی خلوص کی بدولت اس کا جذبۂ دروں از خود اشعار میں ڈھلتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی شاعری کا جو سب سے اچھا اور قابلِ ستائش پہلو ہے وہ اس کے موضوعات ہیں جن میں حمد و نعت اور مناقب و مناجات شامل ہے۔ اس نے اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ شعر کی معروف صنف ''ماہیا'' کو بنایا ہے جو اب اس کی شناخت بھی بن چکا ہے۔

محمد یعقوب فردوسی نے اپنے لئے جس راہ کا انتخاب کیا ہے اس کا پہلا زینہ اظہارِ عشق و محبت ہے اور اس کا یہ سفر یقیناً نہایت دشوار اور کٹھن ہے۔ عشقِ حقیقی اور اللہ کے مقبول بندوں سے محبت کے جذبے سے لبریز انسان جب زبان کھولتا ہے تو اس کی زبان سے ادا ہونے والے لفظوں کی مہک اردگرد کے ماحول کو معطر بنا دیتی ہے۔ محمد یعقوب فردوسی محبت کا پیامبر ہے اور محبت کا دوسرا نام ہی عشق ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے عاشقِ صادق کی پرواز ان بلندیوں کو چھوتی ہے جہاں ہزاروں سال کی عبادت و ریاضت کرنے والے کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ سلطان العارفین

حضرت سلطان باھوؒ فرماتے ہیں:

غوث قطب نے اُرے اُرے، تے عاشق جاندے اگے ھُو

عشق کیا ہے؟ یہ وہ جذبہ ہے جو سچائی کا پہرہ دیتا ہے اور حق اور سچ کی خاطر تکالیف اٹھانا عشق کا خاصا ہے۔ ہم سب اس بات سے آگاہ ہیں کہ انسان مادی دُنیا سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ اس کا خمیر مٹی سے اٹھا ہے، وہ مٹی ہی میں اُگنے والی غذاؤں کو کھا پی کر جیتا ہے اور اسی مٹی کے دامن میں سما جاتا ہے لیکن اس کے اندر جو اہم چیز ہے وہ "روح" ہے جسے "امر الٰہی" بھی کہا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ارشادِ ربانی ہے:

و نفخت فیه من روحی

یعنی اس (انسان) کے اندر آگ، پانی، مٹی اور ہوا کے علاوہ اللہ رب العزت کی طرف سے ودیعت کردہ توشۂ خاص (روح) بھی موجود ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی اللہ رب العزت سے انتہائی محبت کا راستہ اختیار کرتا ہے وہ مادیت کی پستی سے روحانیت کی بلندی کی جانب سفر کرتا ہے۔ جس کی بہترین مثال معراج النبی ﷺ ہے۔ اسی لئے نماز کو مومنوں کی معراج کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس روحانی سفر میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جو زادِ راہ بھی ہے اور چراغِ منزل بھی۔ عشق سے ہی اللہ سے تعلق پختہ ہوتا ہے اور مادیت سے محبت کا انجام فنا اور اللہ رب العزت سے عشق کا انجام بقا ہے۔ اسی لئے فانی سے محبت ہوس اور باقی سے محبت کے جذبے کو بقائے دوام کا جام کہا گیا ہے جسے پی کر آج بھی اللہ والے نہ صرف خود جیتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی زندگی بخش رہے ہیں۔ میاں محمد بخش فرماتے ہیں:

عشق نوں محبوب پیارا آیا نظر اکلا　　　ہر ذرّے نوں سُورج کردا اُس دا نُور تجلا

اور وارث شاہ کے لفظوں میں:

وارث شاہ اوہ سدا ای جیوندے نیں جنھاں کیتیاں نیک کمائیاں نے

اسلامی ادبیات میں صوفیاءِ کرام نے عشقِ الٰہی کی بنیاد پر حیات کے ایسے دیئے روشن

کرنے کی طرح ڈالی جو مرنے کے بعد بھی نہیں بجھتے۔ فارسی زبان کا ایک شعر ہے:

ہر گز نہ میرد کہ دِلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

یعنی جس انسان کے دل میں عشق کی شمع زندہ ہو وہ کبھی نہیں مرتا اور عاشقوں کا نام عشق کی بدولت ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتا ہے۔ مولانا رومی، حافظ شیرازی، شاہ لطیف، خواجہ فرید، وارث شاہ، میاں محمد بخش، اقبال اور غالب وغیرہ سب ہی عشق کی تلوار کے گھائل نظر آتے ہیں۔ مولانا رومی کہتے ہیں:

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دِل زنی یارے بود

یعنی علم کا تعلق اگر صرف بدن سے ہو تو سانپ ہے اور اگر یہ تعلق دل سے قائم ہو جائے تو علم دوست ہے۔ اسی طرح میاں محمد بخش عشق کو زندگی کی بنیاد کہتے ہیں اور بقا کے لئے جذبۂ عشق کو لازم قرار دیتے ہیں۔ صوفیاء کرام نے جہاں سالک کے لئے سب سے پہلی شرط جذبۂ عشق کو قرار دیا ہے وہاں دوسری منزل مرشد کی محبت اور شوقِ دیدار بتائی ہے۔ حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں:

ایہہ تن میرا چشماں ہووے میں مرشد ویکھ نہ رَجّاں ھُو

لُوں لُوں دے مُڈھ لکھ لکھ اکھیاں اِک کھولاں اِک کَجّاں ھُو

اِتنا ڈِٹھیاں صبر نہ آوے، میں ہور کِتے وَل بھجاں ھُو

مرشد دا دیدار باھُوؒ ، مینوں لکھ کروڑاں حجاں ھُو

جب عشقِ الٰہی کا جذبہ اپنے عروج کی طرف گامزن ہوتا ہے تو پھر فقر کی منزل شروع ہو جاتی ہے جہاں سالک کی کیفیت کچھ یوں ہو جاتی ہے:

ایہہ تَن رَبّ سچے دا حجرہ اندر پائیں فقیرا جھاتی ھو

نہ کر منت خواج خضر دی تیرے اندر آب حیاتی ھو

صوفیاء کی ایک اور خاص صفت یہ ہے کہ وہ موت کو کبھی نہیں بھولتے۔ موت اور حیات

کے مابین جو فرق ہے اور ابدی حیات کے جو ثمرات ہیں انہی کا حصول ان کا مطمع نظر ہوتا ہے۔ طریقت اور شریعت کو اسی لئے حقیقت کے دو دھارے کہا گیا ہے یعنی طریقت شریعت کے بغیر اور شریعت طریقت کے بغیر ادھوری ہوتی ہے۔ روزِ آخرت اعمال کی پوٹلی میں سے جو نکلے گا وہی اللہ رب العزت کی قربت اور دیدار کا سامان ہو گا۔ اسی لئے انہوں نے اس فانی دنیا میں صرف اور صرف اچھے اعمال پر زور دیا ہے۔

انہی ہستیوں کے دامنِ فیض سے نسبت و محبت رکھنے والے نفوس دنیوی و اخروی کامیابیوں اور کامرانیوں کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ محمد یعقوب فردوسی صاحبِ نسبت ہے اور وہ اپنی دلی کیفیات کو حمد و نعت کے علاوہ منقبت و مناجات کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ اچھا شاعر ہے اور اردو حمدیہ و نعتیہ ماہیا اس کی پہچان ہے۔ اب تک اردو اور پنجابی زبان میں دو درجن سے زیادہ چھوٹی بڑی تصنیفات پیش کر چکا ہے۔

ایک شاعر کا کلام اس کی ذات کا مظہر ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ شاعر کی ذات متخیلہ ہی اس کے کلام کی ضامن ہوتی ہے۔ اس کلیہ کی روشنی میں جب ہم محمد یعقوب فردوسی کا کلام دیکھتے ہیں تو اس میں ہمیں محمد یعقوب فردوسی مجسم صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔ محمد یعقوب فردوسی نے ایک ایسا نیک، مقدس اور پاکیزہ راستہ اختیار کیا ہے جس پر چلنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں اس نے اپنے مرشد و مربی کے علاوہ بعض بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کے حضور اپنی عقیدتوں کے پھول **"زیارت فقیراں دی"** کے نام سے پیش کرنے کی سعی لاجواب کی ہے اور اس میں خاصا کامیاب نظر آتا ہے:

این	سعادت	بزور	بازو	نیست
تا	نہ	بخشند	خدائے	بخشندہ

ان ماہیوں میں اس نے ماہیے کے عمومی مزاج کو بھی مدِ نظر رکھا ہے اور پوری کتاب میں وہی جذبۂ عشق موجزن ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہوا ہے البتہ بعض مقامات پر اس نے وفورِ

شوق میں دامنِ احتیاط پر اپنی گرفت کو ڈھیلا چھوڑ دیا ہے جبکہ ان معاملات میں احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھنا کسی بھی شاعر کے لئے انتہائی ضروری ہوتا ہے......شاعری بذاتِ خود ایک مشکل فن ہے اور فنی تقاضوں پر گرفت کی کمزوری بعض اوقات قابلِ گرفت بھی ہوتی ہے......تاہم مجموعی طور پر یہ کتاب ایک قابلِ قدر کاوش ہے۔ میری دُعا ہے کہ اللہ رب العزت عشق ومحبت کے اس مسافر کے جذبۂ مہر ووفا اور ولولۂ خلوص وعقیدت کو مزید جلا بخشے اور اس کی راہ میں حائل تمام مشکلات کو رفع فرمائے (آمین)۔

ناول نگاری کی روایت اور زُہیر کنجاہی

ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی لکھتے ہیں کہ ''ناول نگاری سنجیدگی، تجربے اور فلسفیانہ عمل کا نام ہے جو اپنی فکری اساس کی بنیادوں پر ناول نگاروں کو تجربات کا امین اور نظریات کا مبلغ بناتا ہے......کبھی کبھی وہ عمل فن کی ذات تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا ہے......ایسی صورت میں اس کی دلچسپی متاثر ہوتی ہے اور وہ محدود ہو کر رہ جاتا ہے جبکہ ناول کا فن زندگی کی حرکی وما میاتی قدروں کی طرح ادبی تقاضوں کے اعتبار سے بدلتا اور بڑھتا ہے''۔

اچھا ناول نگار فن اور تخلیقی مراحل سے گزرتے ہوئے انسانی زندگی کے رواں دواں مسائل ومباحث سے وابستہ ہوتا ہے۔ناول کے فلسفیانہ پہلو پر غور کیجئے تو علم ہوگا کہ ناول ایک زندہ اور ذی روح شئے ہے۔ یہ زندگی کی تصویر ہی نہیں تفسیر بھی ہے۔غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں زندگی کی عام حقیقتوں کی سچائی ایک ایسے انداز میں واضح کی جاتی ہے کہ پڑھنے والے کو ان کا گہرا شعور ہو جاتا ہے۔اس میں زندگی کے ایسے تصورات کا اظہار ہوتا ہے جس نے ان کی سچائیوں کی عمومیت کو اپنے اندر جذب کرلیا ہے۔اپنی وسعت، گہرائی، تنظیم اور تفسیر حیات کی کوششوں کے ساتھ یہ اس عظمت کا مستحق ہے جو دیپک کو حاصل ہے۔ناول کا سب سے اہم عنصر اس کی دلچسپی ہے۔مختلف واقعات ایک خاص مگر دلچسپ ترتیب کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ کچھ واقعات مختلف کرداروں کے ساتھ بیان ہوتے ہیں۔ان واقعات کے ردِعمل میں عام طور پر دوسرے واقعات کا اظہار ہوتا ہے یوں قصہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ناول انسانی زندگی کے پیچ وخم کی متحرک لفظی تصویر ہے۔انسانی فطرت کے مطابق اس کے واقعات کا اظہار ہوتا ہے۔ انسانی زندگی، اس کا ماحول، انسانی تجربے، فلسفۂ حیات، ادارک، بصیرت، محبت ونفرت، عمل اور ردِعمل کے اعتبار سے ناول زندگی کی دیگر اقدار کی طرح تبدیل ہوتا ہے۔ناول کا موضوع فرد ہے جو سماج کے پسِ منظر میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

ڈرامہ نگار زندگی پر تبصرہ کرتا ہے اور ڈرامے میں صرف عمل ہوتا ہے جس کی تہہ میں ارادے کی قوت ہوتی ہے جبکہ ناول میں عمل بھی ہوتا ہے اور بیان بھی، اس میں ڈرامہ بھی ہوتا ہے اور مصوری بھی۔

جب ہم اردو ناول نگاری کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے ناول کے فن پر طبع آزمائی کی یا تجربے کئے ہیں اور اپنے مشاہدوں کی روشنی میں واقعات کو دلچسپ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے کسی نہ کسی صورت میں ناول کے فن کو آگے بڑھانے کی سعی کی ہے۔ اس میں بہت سے نام آتے ہیں......قرۃالعین حیدر، عزیز احمد، احسن فاروقی، نثار عزیز بٹ، رشیدہ رضویہ جیلانی بانو، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، حیات اللہ انصاری، بانو قدسیہ، شوکت صدیقی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، جوگندر پال، انتظار حسین، انور سجاد اور انیس ناگی وغیرہ......جیسے بے شمار لوگ ہیں......ان سب کے تجربوں کا تجزیہ اس بات کا شاہد ہے کہ ناول کا فن آگے بڑھا ہے اور اس میں ترقی ہوئی ہے۔ اسی طرح ان کے بعد نئے لکھنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے جس سے میں اس وقت دانستہ اجتناب کرتا ہوں۔ تاہم اس سے کی اور بات کا اندازہ ہو نہ ہو لیکن ایک بات بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ ناول نگاری کا فن ترقی پذیر ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اس سلسلے میں ہونے والے تجربے کہیں تو جذباتیت کے نام پر کچھ سے کچھ ہو کر رہ گئے ہیں۔ کہیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسلسل کوشش، لگن، تجسس اور آگے بڑھنے کا جذبہ اچھے ناولوں کے لئے میدان ہموار کر رہا ہے۔ ان حالات میں یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ایک خاص عہد اور علاقے کی مخصوص اجتماعی نفسیات، علامتی رموز، پیچیدہ اور الجھے ہوئے معاشرتی اور معاشی مسائل، فکری منظرنامے کے حوالے سے ناول کو اپنے دور کا عکاس بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ناول لکھنا کسی گہری اور بالائی سطح پر طویل اور عریض خندق پر سے جست لگانے کا فن ہے۔ اس میں محض تجربے، مشاہدے، فکر اور فلسفے ہی کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ کہانی کے بیان کے کرب سے گزرنا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ اچھے ناول عصری و ادبی صداقتوں کے ترجمان ہوتے ہیں۔

اچھے ناول میں وہ تکنیکی، فنی اور جمالیاتی صلاحیتیں ملتی ہیں جو کہانی بیان کرنے پر قدرت رکھتی ہیں اوران کا مخصوص بیانیہ ابہامات سے پاک ہوتا ہے۔ گذشتہ برسوں میں ہمارا معشارہ حیرت انگیز تیز رفتاری سے تغیرات کے مرحلوں سے گزرتا رہا ہے۔ عام سماجی نظام، سیاسی حالات، اقتصادی اور تہذیبی بحران وانتشار نے جہاں ادب کی دوسری اصناف کو متاثر کیا وہاں اردو ناول نگاری پر بھی ان کا اثر ہوا۔ جدید ناول نگاروں کے ناولوں میں فرد اور سماج کی کشمکش اوران سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں لافن کارانہ اظہار ہوا ہے اور یوں اردو ناول نے بڑی کامیابی سے ارتقائی منازل طے کرلی ہیں۔

مزید آگے بڑھنے سے پہلے (ان قارئین سے معذرت کے ساتھ جنہیں اس بحث سے کوئی سروکار نہیں) چند ناول نگاروں کے کام کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اس پس منظر میں کچھ نمائندہ ناول نگاروں کے بارے میں بحث ضروری ہے اور ایسا کرنا یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اردو ناول نذیر احمد دہلوی کے ہاتھوں شروع ہو۔ شرؔر، سرشاؔر...... رُسوؔا سے ہوتا ہوا مختلف ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا منشی پریم چندؔ تک آیا۔ سجاد ظہیؔر کے ناول ''لندن کی ایک رات'' نے اردو ناول نگاروں کو ایک سمت عطا کی اور اس بات کی طرف اشارہ دیا کہ انسان کی نفسیاتی خواہشات اس کی زندگی پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ ''لندن کی ایک رات'' نے اردو ناول نگاروں پر اس بدلتی ہوئی صورت حال کے لئے دروازے کھول دیئے اور اردو ناول نگار اب بڑی فراخدلی کے ساتھ سگمنڈ فرائیڈ، بریخت، جیمس جوائس، ورجینیا وولف اور دوسرے یورپین ناول نویسوں کا مطالعہ کرنے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ بعد کے آنے والے ناولوں میں اس کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ عصمت چغتائی نے سگمنڈ فرائیڈ کا مطالعہ زیادہ گہرائی سے کیا اور جنس سے متعلق فرائیڈ کے جتنے بھی نظریے تھے انہیں نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنی تحریروں میں انہیں کہیں نہ کہیں چسپاں بھی کیا۔ عصمتؔ کی خوش قسمتی یا بدقسمتی یہ تھی کہ اس زمانے میں دوسری کوئی بھی عورت اس دھڑلے سے اردو ادب کے میدان میں نہیں اتری تھی۔ عصمتؔ نے تحلیلِ نفسی اور

لاشعوری محرکات کے ذریعے اپنے ناولوں کے تانے بانے بنے جس کا ہلکا سا پرتو بیدیؔ کے ناول ''اک چادر میلی سی'' میں بھی ملتا ہے۔ عصمت کی باتوں میں کاٹ ہے، طنز کی قوت کمال کی ہے۔ انہیں اخلاقی، تعلیمی، مذہبی اور ادبی ہر قسم کے ڈھونگ سے نفرت ہے۔ اپنی اس بے پناہ نفرت کا اظہار وہ لطیف طنز کے ذریعے کرتی ہے۔ وہ ہماری لاشعوری تہوں تک جا کر ان پوشیدہ حقیقتوں کو نکال لاتی ہے جن پر اخلاق، مذہب اور تہذیب پردے ڈال کر ہماری اخلاقیات کو خراب کر رہے ہیں۔ عصمتؔ کا نظریہ یہ تھا کہ زخموں کو پردوں میں چھپانے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ ان کا علاج ضروری ہےتا کہ وہ مندمل ہو جائیں۔

کرشن چندرؔ اپنی افتادِ طبع کے حوالے سے شدت کے ساتھ رومانی تھے۔ ان کے احساسات اور جذبات میں رومان ہے۔ ان کے افکار اور تخیل کی پہنچ رومانی اور ان کا سلوبِ اظہار بھی اپنے اندر رومانیت کا رنگ وآہنگ لئے ہوئے ہے۔ کرشن چندرؔ کی شخصیت میں رومانیت اور حقیقت پسندی نے مل کر متوازن ہم آہنگی پیدا کر دی لیکن یہ بھی کہا جاتا رہا کہ ان کی طبیعت کی شدت پسندی نے فن کی باریکیوں پر اثر ڈالا ہے۔ وہ اپنی مقصدیت کی تبلیغ کی دُھن میں کرداروں کے فکری نشو ونمائی مراحل کو قربان کر دیتے ہیں اور جہاں مقصدیت پسِ پشت ہوئی وہاں رومانیت غالب گئی ہے۔ البتہ کرشن چندرؔ کے ہاں فطرت کا گہرا مطالعہ ہے۔ اونچی نیچی چوٹیاں، گہری وادیاں، آبشار، مرغزار، چشمے، پگڈنڈیاں، گلیشیر، ندیاں، پہاڑ، جھیلیں......سب کے سب منہ بولتی تصویریں بن گئی ہیں۔ ان کے مشہور ناول'' شکست'' میں اور کچھ ہو نہ ہو رومانس کو جھلکانے اور چمکانے میں بڑی مدد ملی ہےاور پورے قصے میں نغمے کا سا لطف اور رَس بھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدیؔ کے مزاج میں ہمیں ایک طرح کا ٹھہراؤ ملتا ہے۔ وہ حالات کے تحت جذباتی نہیں ہوتے۔ ان کی جزئیات نگاری میں جان ہے جس سے ان کے گہرے مشاہدے کا علم ہوتا ہے۔ وہ سماجی مسائل ہی کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ ان کا بھرپور انداز ان کے جذبات و

احساسات کی نمائندگی کرتا ہے۔ بیدی نے اپنی تخلیقات میں پنجاب کی دیہی زندگی کے تہذیبی اور سماجی پہلوؤں کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ انہیں انسانی نفسیات پر گہرا عبور حاصل ہے۔ انسانی نفسیات کی باریک لہروں کی تصویریں بنانے میں انہیں مہارت حاصل ہے۔ ان کے تجربات کی وہ تمام وسعتیں جو کہانیوں میں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں وہ سب ''اک چادر میلی سی'' میں یکجا ہو گئی ہیں۔ اس ناولٹ میں کردار نگاری بے حد پُرکشش اور اثر انگیز ہے اور یہ سارے کردار ان کے عمیق مشاہدے کی دین ہیں۔

عزیز احمد اردو ناول نگاری میں ایک بڑا نام ہے۔ ان کی تخلیقی مہارت اپنی جگہ پر اہم ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ جنسی فعل اور اس سے ابھرنے والے تلازمے ان کا فلسفہ بن جاتے ہیں۔ وہ شہوانی جذبات کو بھڑکانے والے مکالموں سے قاری کو اس طرح الجھا دیتے ہیں کہ وہ سفلی حرکات کے اظہار کو اپنی زندگی کا محور سمجھنے لگتا ہے۔ فحاشی اور رنگین تلذذ کے انداز میں پڑھتے پڑھتے قاری حیوانی حرکتوں کو بھی معیوب نہیں سمجھتا۔ اس قسم کے خیالات اور مکالموں سے عزیز احمد کی فنی خوبیاں متاثر ہونے لگتی ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ عزیز احمد کو یہی چیز سب سے زیادہ مرغوب ہے۔ ان کے تمام ناولوں کو پڑھنے کے بعد جہاں ان کی فنی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر ہوتا ہے وہاں ان کے ناول کے موضوع کے جنس زدہ ہونے کی بھی بات کی جاتی ہے۔ خود عزیز احمد کا اس بارے میں اعتراف ملاحظہ ہو...... ''جنسی مسئلوں اور پیچیدگیوں پر ادب میں ٹھنڈے دل سے غور کرنا اور ان پر بحث کرنا یا ان کا مطالعہ کرنا تو بلاشک اس عہد اور خصوصاً ہندوستان میں ایک بہت مفید اور اہم کام ہے لیکن جنسی موضوع کے طلسم میں گرفتار رہنا، جنس کو آرٹ یا ادب کے لئے مقصود بالذات سمجھنا ترقی پسندی نہیں بلکہ انسانی درجے کے تنزل کی نشانی ہے۔''

دراصل عزیز احمد نے ناول کا مطالعہ عالمانہ نظر سے نہیں بلکہ ادیبانہ نظر سے کیا تھا اور ناول نگاری کا شوق ان کی فطرت کا جزو بن گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کو عزیز احمد کا سب سے اچھا ناول قرار دیتے ہیں۔ وہ اسے ''تہذیب'' اور ''امراؤ جان ادا''، ''شام

اودھ' اور ''فسانۂ آزاد' کی قبیل کا ناول کہتے ہیں لیکن میرے خیال میں عزیزؔ احمد کا غالب رویہ جنس نگاری ہی ہے۔ تاہم عزیزؔ احمد کے ناولوں کا اگر ہم تفصیلی جائزہ لیں تو ناول کے فن کے حوالے سے بہت سی باتیں انہیں ممتاز بناتی ہیں۔ ان کے پہلے دو ناولوں کے کرداروں میں واقعیت اور حقیقت پسندی کا بڑا فقدان ہے لیکن ''گریز'' کا نعیم جن داخلی کیفیات، ذہنی انتشار اور نفسیاتی الجھنوں کے علاوہ خارجی حالات اور عوامل سے گزرتا ہے اس کی آئینہ سامانی بڑے ہی فنکارانہ طور پر کی گئی ہے۔ انہوں نے نہایت دانشمندی کے ساتھ شہری زندگی کی الجھنوں، جذباتی پیچیدگیوں، ذہنی کرب، مغربی اور مشرقی اقدار کے تصادم، ہندوستان کی تہذیب وتمدن کی شکست وریخت، اعلیٰ اور متوسط طبقے کی نفسیاتی کشمکش کو بڑی فنی مہارت اور بصیرت کے ساتھ دلچسپ اور تیکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ عصمتؔ چغتائی کی طرح عزیزؔ احمد بھی سگمنڈ فرائیڈ کے نظریات سے متاثر نظر آتے ہیں۔

حقیقت نگاری کے حوالے سے حیات اللہ انصاریؔ کا نام اردو ناول نگاری میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ منشی پریم چندؔ اور حیات اللہ انصاریؔ میں یہ فرق ہے کہ پریم چندؔ نے اپنے ماحول اور سماجیات پر زیادہ توجہ دی جبکہ حیات اللہ انصاریؔ کے ہاں گاؤں اور شہر والوں کی عام زندگی کے مناظر ہیں۔ وہ اگر کسی کے سخت مخالف ہیں تو وہ انگریز حکومت اور اس کی جابرانہ استعماریت ہے۔ انہوں نے اپنے طویل ترین ناول ''لہو کے پھول' میں تاریخی واقعات کو تخلیقی رنگ و آہنگ عطا کر کے فن کاری کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے، باوجود اس کے کہ یہ ایک تاریخی ناول ہے اس میں اس دور کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ کی ترتیب کے لئے نتیجہ خیز مواد فراہم ہوسکتا ہے۔ یہ ناول چھبیس سو آٹھ (2608) صفحات اور پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا طرز بیان خالص بیانیہ ہے اور اس میں قدامت کا رنگ غالب ہے لیکن ناول کی فضا اپنے عصر کو سمجھتی ہے، جس کا ارتقاء بے حد فطری ہے۔ اس میں اعلیٰ طبقے کی زندگی، شہری زندگی کے سماجی مسائل، دیہاتیوں کی عام زندگی، رسم و رواج سے ان کی مجبوریاں، الجھنیں، پریشانیاں، خوشیوں کے ماتمات، نچلے طبقے کی

تصویر کشی، پس ماندہ عورتوں کی عام حالت، جنسی معاملات، ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات، کشاکش، فریب، شکستگی، اُمید، خوف ویاس، بلند ہمتی، رواداری، اخلاقیات، مذہبی اور سماجی زندگی، رسم ورواج کی پابندیاں، پسماندگی سے بھرپور سماج کا حقیقت پسندانی تجزیہ موجود ہے۔

قرۃ العین حیدر کے شروع کے ناولوں میں خاص طور سے ''میرے بھی صنم خانے'' اور ''سفینۂ غمِ دل'' میں اعلیٰ درجے کے فارغ البال خاندان ہیں اور انتہا اس کی تباہی ہے۔ قرۃ العین حیدر کو فنونِ لطیفہ سے دلچسپی ہے۔ خیالات میں بلا کی روانی، سلاست اور ٹھہراؤ ہے۔ اسلوب بیان بھی رنگین ہے۔ انہوں نے منظر نگاری کے بھی جوہر دکھائے ہیں۔ انہوں نے بڑے المیہ انداز میں لکھنؤ کی زندگی کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ ان کے ناولوں میں لکھنوی تہذیب اور لکھنؤ کی زندگی کی عکاسی کرتی ہوئی جس معاشرت کے خدوخال نمایاں کئے گئے ہیں اس معاشرے میں عوام اور خواص کی تخصیص نہ تھی۔ مگر یہاں زندگی کی عکاسی صرف خواص تک محدود ہے۔ اس طبقے تک جو جاگیردارانہ سماج کی اعلیٰ اور شریفانہ قدروں کا امین تھا۔

گذشتہ پچاس پچپن برسوں میں اردو ناول نے پرانی دُنیا سے نئی دُنیا کی طرف جو پیش قدمی کی ہے اس کے نتیجے میں متعدد نئے رجحانات ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ بعض اوقات ان مختلف رجحانات میں تصادم اور آویزش کی صورت بھی پیدا ہوئی ہے۔ کمزور اور پیش پا افتادہ رجحان معدوم ہو گیا ہے اور نسبتاً نئے اور صحتمندانہ رجحانات کو فروغ ملا ہے۔ دراصل جدید اور بالخصوص اچھا لکھنے والوں نے اپنی زبان وادب کے ماضی کو، اس کی شاندار روایات کو اور ماضی کی تخلیقات کو نہیں بھلایا ...... بلکہ ماضی اور حال کے درمیان ایک رابطے کی صورت پیدا کی ہے۔ کیونکہ ماضی ان کا اپنا ہے اور ماضی ہی ہمارے ادبی تسلسل اور کلچر کی تاریخی کڑی ہے۔ حال اور مستقبل اسی ماضی کے بہاؤ کا لازم ہیں جس کے سنگِ میل ڈپٹی نذیر احمد، عصمت چغتائی، کرشن چندر، عزیز احمد، انتظار حسین، سجاد ظہیر، حیات اللہ انصاری، ممتاز مفتی وغیرہ ہیں۔ حال اور مستقبل

کی اضافی اقدار کے تعین کے لئے ماضی کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ خاص طور پر ان ادیبوں کا مطالعہ جنہوں نے ہماری زبان وادب کی مشاطگی میں اپنی عمر صرف کر دی۔ جنہوں نے اپنے عہد کی ترجمانی کرتے ہوئے اسے حقیقت پناہ بنایا اوران رجحانات کو آگے بڑھایا کہ جن کی مدد سے آج ہم منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔ جب زندگی کی قدریں بدل جاتی ہیں تو آرٹ اور فن بھی تبدیل ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ زندگی بدلتے ہوئے بھی پیہم رواں ہے اور زندگی ماضی، حال اور مستقبل کو ایک تاریخی تسلسل میں باندھے رکھتی ہے اسی طرح ادب میں بھی ارتقاء کا سلسلہ جاری ہے جو اکیسویں صدی میں بھی جاری رہے گا۔ بلا شبہ بصری اور سمعی ذرائع ابلاغ کی بالادستی میں مزید اضافہ ہوگا لیکن ''تحریر اور تخلیق'' کے ذریعے ہی ادب عالیہ کو استحکام اور فروغ حاصل ہوگا۔

کرشن چندر لکھتے ہیں:

''......اگر کسی اچھے ناول نگار، افسانہ نویس، ڈرامہ نگار، نقاد یا انشائیہ نگار کی توصیف مقصود ہو تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک شاعر ہے۔ شاعر درحقیقت ادب کی معراج ہوتا ہے اور اس کی بہترین روایتوں کا حامل......اس کا کلام ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں ملک وقوم کی سچی تصویر نظر آتی ہے''۔

زُہیر کنجاہی بنیادی طور پر ایک کامیاب شاعر اور افسانہ نویس ہے۔ کہانی کہنے اور بات سمجھانے کے گُر سے اچھی طرح نہ صرف واقف ہے بلکہ اردو ناول کی تاریخ کا وسیع مطالعہ و مشاہدہ اس کی گھٹی میں پڑا ہے۔ اس کی اکثر کہانیاں اور افسانے پڑھنے کے بعد جو تاثر فوری طور پر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی قوت، اپنے اردگرد پھیلے ہوئے اجتماعی رویوں، سماجی مسائل اور نفسیاتی رجحانات سے اخذ کرتا ہے۔ کہانی میں وہ ان لوگوں کے احوال اس طرح بیان کرتا ہے جیسے وہ حقیقی زندگی میں ہیں۔ اس کا اسلوب realism یا حقیقت نگاری ہے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس کی کہانیوں اور اکثر افسانوں میں رومانیت ملتی ہے لیکن جنس زدہ تلذذ ہرگز نہیں۔ یادیں اس کا

وہ سرمایہ ہیں جس سے وہ اپنی تخلیقات کی بنیادیں استوار کرتا ہے اور پھر اپنے تخیل کی بے پناہ جولانی سے ایک طلسمی فضا تعمیر کرتا ہے جس میں اس کی کہانی کے کردار آگے بڑھتے ہیں۔ وہ ناول کی روایت اور تاریخ کا گہرا شعور رکھتا ہے۔

زُہیر کنجاہی نے اپنے افسانوں اور ناول میں جو کردار تراشے ہیں وہ روزمرہ کی زندگی میں نظر آنے والے معمولی لوگ ہیں جو غیر معمولی صلاحیتوں، خوبیوں اور خصائص کے حامل ہیں۔ اسے اپنے کرداروں کی غیر معمولی اور پوشیدہ صلاحیتیں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کی نفسیات کا پوری طرح ادراک رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک تخلیق کا سر چشمہ حقیقت ہی ہے کیونکہ حقیقت کو پوری طرح اپنے فنی شعور اور اسلوب بیان کی گرفت میں لے آنا اسے تسخیر کر لینے کی ہی ایک شکل ہے۔ زُہیر کنجاہی کی تحریر میں آپ وہی سحر دیکھیں گے۔ گویا اس کی حیرت اور مسرت سے اچانک گزر جانے کی تکنیک ایک اہم فنی صلاحیت کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ زُہیر کنجاہی اپنی زندگی کے اہم واقعات کو ناول اور افسانے کی بنیاد بناتا ہے۔ اس لئے اس کا فکشن Autobiographical نظر آتا ہے۔ اس کے ہاں حالات و واقعات کی تکرار ملتی ہے لیکن یہاں اس کی ایک اور خوبی یا صلاحیت جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہر بار کسی واقعہ کو دھراتے ہوئے اس میں کسی نئی بات کا اضافہ کر دیتا ہے۔

مارٹن لگر نے شیکسپیئر پر اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ ''......ایک بڑا تخلیق کار اپنے طور پر کائنات کی تشکیل کرتا ہے۔ وہ جس دُنیا میں رہتا ہے، روزمرہ کی زندگی گزارتا ہے اس میں اپنی آرزوئیں، خواہشات اور خواب شامل کر کے ایک نئی دُنیا تخلیق کرتا ہے جو پرانی دُنیا سے بیک وقت مماثل اور متضاد ہوتی ہے''۔ زُہیر کنجاہی کے ہاں بھی ''عرفان محل'' کی حد تک ایک نئی دُنیا کی تخلیق کی کوشش نظر آتی ہے۔ جو بیک وقت پرانے عہد کی کہانی بھی ہے اور نئے دور سے متصادم بھی......انسان کی خارجی دُنیا کی ویرانی اور اس کیا اپنی زندگی کے ساتھ شدید وابستگی کا عمومی رویہ ''عرفان محل'' میں جا بجا نظر آتا ہے۔ اس میں جذبات کی وارفتگی اور احساسات کی فراوانی ہے۔

ناتمام آرزوؤں کا نوحہ بھی ہے، عشق و محبت کا کلاسیکی آہنگ اور روایتی رکھ رکھاؤ بھی ہے اور اس ازلی سچائی کا اظہار بھی ملتا ہے کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں۔ اس ناول میں ایک سیلف میڈ پروفیسر کا قصۂ درد ایک داستان کی صورت بیان کیا گیا ہے اور اس جد و جہد میں زندگی کے مختلف ادوار میں اجتماعی رویوں اور نا آسودہ خواہشات کی تکمیل کی حسرت ناتمام کا نوحہ بھی ہے۔ یوں تشنگی اور جستجو کا امتزاج اس ناول کو ایک ممتاز مقام پر کھڑا کرتا ہے۔

زُہیر کنجاہی نے اس ناول میں جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ بیانیہ ہے۔ جس کا امتیاز یہ ہے کہ وہ فرد کے خارج و باطن، سماجی، سیاسی اور شخصی سطحوں کو ایک دوسرے میں اس طرح گوندھتا ہے کہ قاری ایک پیچیدہ متن کے بجائے روانی اور متانت پاتا ہے اور کہانی، واقعات اور کرداروں کی حرکات سے لطف اٹھاتا ہے۔ اس طرح زُہیر کنجاہی کی یہ فنی پختگی اس کے اندازِ بیان پر اس کی گرفت کو بھی جنم دیتی ہے جس سے مختلف فکری سطحیں ایک دوسرے میں یوں مدغم ہوتی ہیں کہ وہ اپنے اپنے امتیازات کو قائم بھی رکھتی ہیں اور ایک بڑے دائرے کی صورت ایک دوسرے میں تحلیل بھی ہو جاتی ہیں ...... یہی فکشن کی معراج ہے اور ''عرفان محل'' اس طرز کا اعجاز ہے۔

......

☆...... زُہیر کنجاہی کے ناول ''عرفان محل'' کا تعارفی مضمون (ناشر: ادارہ فروغ ادب پاکستان-۱۳۲ اے-استقلال آباد، سرگودھا: ۲۰۰۴ء)

عنایت حسین بھٹی کی کالم نگاری

۱۷۴ صفحات کی ضخامت کی کتاب ''عنایت حسین بھٹی کی کالم نگاری' میرے سامنے ہے اور اس میں شامل ۱۰۴ کالم جناب عنایت حسین بھٹی کے وسیع مطالعے، گہرے مشاہدے اور ان کے تہذیبی و معاشرتی شعور کی ایک جامع تصویر پیش کرتے ہیں۔ کسی معمولی واقعہ اور اس کی جزئیات کے پہلو سے نکلتے معاشرتی اثرات کو محسوس کرنے کے لئے ایک حساس دل اور دقتِ نظر کی ضرورت ہوتی ہیں۔ ان کالموں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ عنایت حسین بھٹی میں یہ دونوں خداداد صفات موجود تھیں۔ ان کا دل انتہائی حساس اور ان کی نظر انتہائی عمیق تھی۔ انہوں نے معاشرتی خرابیوں پر جہاں شدید نکتہ چینی کی اور ان کے تدارک کی عملی راہیں سجھائیں وہیں حکومت اور افراد کے انفرادی اور اجتماعی اچھے کاموں پر برملا تحسین بھی کی۔

ریڈیو، تھیٹر، سرکس، فلم، گلوکاری، اور محقق اور کالم نویس عنایت حسین بھٹی کے فن اور شخصیت کے کئی روپ ہیں اور کئی جہتیں ہیں جن پر بات کی جا سکتی ہے لیکن سرِ دست دو کجا ہیوں کی مشترک کاوش ''عنایت حسین بھٹی کی کالم نگاری'' کے حوالے سے اپنے تاثرات و احساسات میں آپ کو شریک کرنا چاہتا ہوں۔ عنایت حسین بھٹی ۱۹۲۶ء کو ماسٹر فضل الٰہی بھٹی کے ہاں محلہ فتو پورہ گجرات میں پیدا ہوئے۔ قرآن پاک کی تعلیم والدہ محترمہ سے ۱۳ سال کی عمر میں مکمل کی۔ میٹرک کا امتحان پبلک ہائی سکول اور ۱۹۴۹ء میں زمیندارہ کالج گجرات سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (پنجابی) اور ایم اے (اسلامیات) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ہدایت کار نذیر کے توسط سے فلموں میں پلے بیک سنگر کی حیثیت سے فنی زندگی کا آغاز کیا۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے بھی منسلک رہے۔ بے شمار اردو، پنجابی، سرائیکی اور سندھی فلموں میں کام کیا، کہانیاں لکھیں، فلمیں بنائیں، ایک ہزار سے زائد گانے ریکارڈ کرائے، بہت سے گانے لکھے اور بے شمار فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک عرصہ تک تھیٹر اور

سرکس میں اداکاری اورگلوکاری کرتے رہے۔پاکستان ٹیلیویژن پر صوفیائے کرام اوراولیائے عظام کے متعلق چانن ای چانن، اُجالا اور تجلیوں کے مراکز کے عنوان سے پروگراموں کی ایک سیریز شروع کی جو بہت عرصہ تک چلتا رہا۔اردو اور پنجابی زبان میں بے شمار مضامین لکھے۔متعدد گیت، نظمیں اور میراثی وقصائد لکھے لیکن ان کی کالم نگاری پر کتاب دیکھ کر ان کی ایک نئی جہت، نئی صفت اور نیا روپ سامنے آیا۔روزنامہ پاکستان لاہور میں ''چیلنج'' کے عنوان سے انہوں نے مسلسل کالم نگاری کی اور ان کالموں کو بڑی جانکاہی اور کاوش کے ساتھ جناب پروفیسر زہیر کنجاہی اور ہفتہ روزہ کامرانیاں کے ایڈیٹر جناب احسان فیصل کنجاہی نے مرتب کر کے ادب دوستی اور عنایت حسین بھٹی سے والہانہ عقیدت کا ثبوت دیا ہے۔

ڈاکٹر وسیم انجم کے ''سنہرے لوگ''

خاکہ نگاری سب سے مشکل اور کٹھن کام ہے اور اس سلسلے میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ خاکہ نگار کو ترازو کے دونوں پلڑوں کو متوازن رکھنا پڑتا ہے۔ دوسرے اگر آپ اپنے احباب کا خاکہ لکھ رہے ہیں تو جانب داری کا الزام آ سکتا ہے اور اگر حلقۂ احباب سے باہر کسی شخصیت کا خاکہ تراش رہے ہیں تب بھی گروہ بندی یا ادبی چپقلش جیسے الزامات لگائے جاتے ہیں۔

اردو زبان میں خاکہ نگاری باقاعدہ فن کے طور پر تسلیم کر لی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد وسیم انجم کی پہچان کا سب سے مضبوط حوالہ اقبالیاتی تحقیق ہے۔ اقبال شناسی کے علاوہ بھی انہوں نے بے انتہا تحقیقی کام کیا ہے۔ لیکن تحقیقی خاکہ نگاری کی خشتِ اول کا انہی کے ہاتھوں رکھا جانا ایک بہت بڑی کامیابی اور صلاحیت ہے۔ میرے ناقص علم کی حد تک اتنی تحقیق اور تفصیلی حوالوں سے بھرپور خاکہ نگاری کم از کم اردو زبان میں اس سے پیشتر نہیں ہوئی۔ البتہ خاکہ نویسی کی روایت میں یہ ضرور شامل رہا ہے کہ کسی بھی شخصیت کا خاکہ اڑاتے سمے ہاتھ اس کے گریبان سے نیچے نہیں آنے دیا جاتا۔

ڈاکٹر محمد وسیم انجم کی اعلیٰ ظرفی، علم دوستی اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار سے محبت کا اس سے بڑا اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے حلقۂ احباب سے ان افراد کا انتخاب کیا ہے جو اس سرزمین کے عام لوگ ہیں...... نہ وہ کوئی آسمانی مخلوق ہیں اور نہ ملکوتی پیکروں میں ملفوف شخصیتیں ہیں۔ ڈاکٹر وسیم صاحب نے اپنے خاندانی بزرگوں، بزرگانِ دین، علاقے کے شہدا، ادیبوں اور شعراء کے ساتھ اپنی عقیدتوں، محبتوں اور چاہتوں کا اظہار بھرپور انداز میں کیا ہے جس کی بدولت ڈاکٹر محمد وسیم انجم صاحب کی اپنی شخصیت اور ذاتی زندگی کے کئی ایک مخفی گوشے بھی منظرِ عام پر آئے ہیں جو ''ان شاء اللہ'' مستقبل کے محققین کے بطور حوالہ کام آئیں گے۔

میں اپنی ذاتی حیثیت میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ ''محمد وسیم انجم'' جب

ڈاکٹر اور پروفیسر نہیں تھے تب بھی انہوں نے زندگی گزارنے اور خوش رہنے کا دوسروں سے الگ اور ایک منفرد انداز اختیار کیا ہوا تھا۔ دوستوں کی محافل میں جب کسی کی غیبت شروع ہوتی تو وسیم صاحب بحث سے الگ ہو جاتے......اور جب کسی کی تحسین کی جاتی تو بڑی گرم جوشی سے تائید کر دیتے......اس اعلیٰ شخصی خوبی کا جس انداز میں انہوں نے اپنے ان خاکوں میں استعمال کیا ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ انہوں نے حسبِ سابق تخلیق کے ساتھ تحقیق کی طرف زیادہ توجہ دی ہے جس کی بدولت ان کی تخلیق ادبی معیار کی تو ہے ہی لیکن یہ اعلیٰ اخلاقی اور تحقیقی معیار کی کسوٹی پر بھی پورا اترتی ہے۔

''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' کے مصداق ہر شخصیت اور ہر ایک فرد دوسرے سے جدا ہے۔ کسی کی شخصیت، کسی کی علمیت، کسی کی اہمیت اور کسی کی محبت کا رنگ اُجاگر کرنے کے لئے ڈاکٹر محمد وسیم انجم نے تصویر کشی کی ہے۔ ہر ایک شخصیت کا خاکہ دوسرے سے جداگانہ ترتیب اور مٹھاس کے رنگ لئے ہوئے ہے لیکن سب میں جو یکساں چیز ملتی ہے وہ ڈاکٹر محمد وسیم انجم کے دل میں ان شخصیات کے لئے عقیدت، محبت، انسیت اور الفت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے کہ جس نے ان مختلف الخیال، مختلف النوع اور مختلف طبقہ ہائے فکر کے لوگوں کو ایک مالا میں پرو کر ''سنہرے لوگ'' بنا دیا ہے۔ تین چار اصحاب سے میری بھی شناسائی کی حد تک واقفیت رہی ہے اور ہے اس لئے میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر محمد وسیم انجم صاحب نے انہیں جس رنگ اور جس نظر سے دیکھا ہے وہ لوگ اس کے نہ صرف مستحق ہیں بلکہ ان کے خاکوں میں ان کی تصویریں کچھ اور نمایاں ہو گئی ہیں۔ کتاب سے زیادہ کتاب میں دیئے گئے حواشی اور تعلیقات میں حوالہ جاتی مواد کی بڑی اہمیت ہے جس کا تحقیقی انداز منفرد اور اسلوبِ بیان بہت خوبصورت ہے۔ حواشی میں ان شخصیات کا ذکر آیا ہے جو نادرِ روزگار اور گوہرِ یکتا تھے۔ ایسے لوگوں کی مثال خال خال ہی مل سکے گی۔ مثلاً ماہرِ عروض فضل الرحمٰن عظیمی صاحب مرحوم، شاعرِ بے بدل اجمل جنڈیالوی مرحوم، معروف انشائیہ نویس اور افسانہ نگار مشتاق قمر مرحوم اور مترجم اقبال پروفیسر ڈاکٹر

عبدالغنی جیسے لوگوں کا ذکرِ خیر تفصیل کے ساتھ حواشی و تعلیقات کے باب میں آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ہر نقش، نقشِ اول سے بہتر، مستند اور خالص محققانہ دقتِ نظر کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ (آمین)۔

آخر میں ایک ناگفتنی بات پیشگی معذرت اور خلوصِ نیت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہر شخص کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے اور بات کرنے کا ڈھنگ بھی سب کا ہر ایک سے جداگانہ ہے۔ یہ بات بھی میرے علم میں نہیں کہ جناب خالد بھوتال صاحب سے ڈاکٹر وسیم انجم صاحب کے تعلقات کس درجہ یا سطح پر ہیں لیکن ان کی ''میٹھے، کڑوے اور بے ذائقہ آموں'' والی بات جس ناگواری کا احساس دلاتی ہے اس سے کہیں زیادہ ڈاکٹر صاحب کی اعلیٰ ظرفی کا بین ثبوت فراہم کرتی ہے کہ انہوں نے ان کی تحریر کو بھی حرف بحرف اپنی کتاب میں شامل کرلیا۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ جناب خالد بھوتال صاحب نے وسیم صاحب کو احتیاط اور مقام و مرتبے کا احساس دلاتے ہوئے از خود احتیاط کا دامن چھوڑ دیا ہے.....نجانے کیوں؟ میں تو جناب بھوتال صاحب سے اپنا ایک شعر ہی عرض کرسکتا ہوں:

کسی یقین، کسی اعتبار کے ہاتھوں
''سنہرے لوگ'' بنے ہیں ''سنار'' کے ہاتھوں

حرفِ چند (نگارشاتِ وسیم انجم)

دیکھتا ہوں تو کبھی چاند کبھی پھول ہے وہ
اپنی صورت مجھے ازبر نہیں ہونے دیتا

ڈاکٹر محمد وسیم انجم ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ وہ اپنی ذات میں ایک ایسی انجمن ہیں جس کی کئی جہتیں اور پرتیں ہیں۔ ہر جہت اور ہر پرت میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا نیا روپ اور نیا پیکر سامنے آتا ہے۔ زندگی کے وہ تمام ادوار جن میں قدرت کی عطا کردہ دنیاوی نعمتوں اور لذتوں سے حظ اٹھایا جا سکتا ہے ڈاکٹر محمد وسیم انجم نے تحصیل علم اور حصولِ دانش کی نظر کر دیے اور آج تحقیق، تخلیق، تدوین، ادب اور بالخصوص اقبالیاتی تحقیق میں جو مقام آفرین وہ حاصل کر چکے ہیں کہ جس پر اہلِ علم وفن کے بے شمار حلقے رشک کرتے ہیں۔

زیرِ مطالعہ کتاب ''نگارشاتِ انجم'' میں ڈاکٹر صاحب کے وہ دیباچے، مضامین، مقالات، تبصرے اور تجزیے شامل ہیں جو انہوں نے مختلف شخصیات، کتابوں اور موضوعات پر مختلف ادوار میں لکھے اور ملکی رسائل و جرائد میں چھپے۔ قرآن، نعت، مکاتیبِ رسولؐ، تصوف، تاریخ، ادب، تحقیق، تنقید، شاعری (غزل، نظم، ماہیا وغیرہ)، شخصیات، اقبال شناسی، رسائل و جرائد کون سی صنفِ ادب ہے جس پر ڈاکٹر صاحب، نے قلم نہیں اٹھایا؟۔ ہر ایک موضوع پر بڑے مدلل، جاندار اور بھرپور انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے مندرجات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کسی بھی موضوع کو تشنۂ تکمیل نہیں چھوڑا بلکہ ہر ایک پتھر کو الٹ پلٹ کر دیکھا ہے اور ہر کونے میں ہاتھ ڈالا ہے۔ تذکرہ نویسی ہو یا دیباچہ نگاری، تبصرہ ہو یا سوانح نگاری...... تنقید ہو یا تحقیق، تخلیق ہو یا تحسین ڈاکٹر صاحب نے ہر میدان میں اپنے قلمی و علمی جوہر کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ فیض احمد فیض ہو یا احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا ہوں یا ڈاکٹر رحیم بخش شاہین...... راقم الحروف جیسے انگلی کٹا کے شہیدوں میں شامل ہونے والے یا شاکر کنڈان اور پروفیسر ڈہیر کنجاہی

جیسے علم وادب کے ہمالیہ..... ہر ایک کو ایک نظر سے دیکھنا ڈاکٹر محمد وسیم انجم صاحب کی وسیع القلبی اور انسان دوستی کا بین ثبوت ہے۔

ہنری لوپر کے بقول "انسان میں علم کے تین سرچشمے ہیں..... عقل، ادراک اور تفکر"..... "نگارشاتِ انجم" کا مسودہ پڑھ کر میری عقل، ادارک اور تفکر کہیں پاتال میں پڑے جا پڑے..... میں رشک اور حسد کی تپش میں مبہوت ہو کر رہ گیا..... یاالٰہی مجھے بھی ایسی توفیق عطا فرما..... یارب العزت یہ شخص ہر روپ میں راہروانِ شوق سے چار قدم آگے کیوں نظر آتا ہے؟؟؟

مختلف موضوعات پر اظہار خیال وہی شخص کرسکتا ہے جو وسیع المطالعہ ہو..... جس کا تخلیقی وتنقیدی شعور نہ صرف بیدار ہو بلکہ اس کی زیر بحث موضوع پر مکمل گرفت بھی ہو..... اسلوب بیان اور طرز نگارش کے ہنر سے بہرہ ور بھی ہو..... اپنی بات کو استدلال اور علم کی بنیاد پر منوانے کا شعور بھی رکھتا ہو..... اللہ رب العزت نے ڈاکٹر صاحب کو اس دولت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت تک ایک درجن سے زائد کتب تخلیق، تالیف، مدون اور مرتب کر چکے ہیں۔ ان کا ہر نقش، نقشِ اول سے بہتر بلکہ بہت بہتر ہوتا ہے۔ ان مضامین ومقالات کو پڑھنے کے بعد ان کی علمیت، دانش اور تخلیقی وتحقیقی شعور کی بلندی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تاہم جو بات ان کی کتابوں میں قدر مشترک کے طور پر نظر آتی ہے وہ ان کا اسلوب نگارش، تحقیقی دقتِ نظر اور احباب سے والہانہ محبت کا اظہار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تخلیقی تحقیق وتنقید کو جس قدر توجہ اور انہماک سے اہمیت دی اس کو نہ سراہنا یا اس کی جانب سے سرسری گزر جانا ڈاکٹر صاحب جیسی شخصیت کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے۔

ہوسکتا ہے بعض ناقدین ان کی کثرت اشاعت کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوں۔ ایسے ناقدین کی خدمت میں اتنا عرض کرنا ہے کہ سمندر کی گہرائی اور گیرائی جس قدر بھی جانچی اور پرکھی جائے اسی قدر اس کے اندر سے نئے خزانے اور نئی دریافتیں برآمد ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد وسیم انجم علوم وفنون کا ایک ایسا سمندر ہے کہ جس کے اندر جستجو، تحقیق اور اشتیاق کے بے پناہ دفینے محفوظ

ہیں۔ تلاش جس قدر وسیع ہوگی دریافت اسی قدر بیش قیمت اور نایاب ہوگی۔

"نگارشاتِ انجم" کے تمام مضامین، مقالات، تجزیے اور تبصرے اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہم ایک علمی اور فکری کتاب کے چند جملوں یا پیراگراف کو کوٹ کرنے کے بجائے ہر ایک مضمون، مقالے اور تبصرے پر سیر حاصل بحث کریں لیکن سیر حاصل بحث سے دانستہ اجتناب کرتے ہوئے ایک سچی بات لکھنے پر مجبور ہوں وہ یہ کہ "نگارشاتِ انجم" کے یہ تعارفی کلمات لکھتے وقت راقم الحروف کا دل اور دماغ مسلسل کتاب کے جہانِ معنی کی سیر کرتے رہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ نگارشاتِ انجم جب آپ کے مطالعے میں آئے گی تو میری طرح آپ بھی ایک مدت تک اس کی سحر آفرینی سے باہر نہ آسکیں گے۔ اللہ رب العزت ڈاکٹر محمد وسیم انجم کو زیادہ سے زیادہ علمی و تحقیقی شاہکار تخلیق کرنے کی توفیق ارزانی عطا فرمائے (آمین)

دیباچہ......مطالعۂ اقبالیات از ڈاکٹر محمد وسیم انجم

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے ساقی
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

''اقبالیات'' ایک وسیع تر موضوع کے بجائے ''دقیق ترین فن'' کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اقبالؒ وہ عظیم ہستی ہے جس کے فکروفن کی چکاچوند سے دنیائے ادب وفلسفہ کی آنکھیں خیرہ ہورہی ہیں۔ علم وادب کے اس بلندترین ہمالیہ کی چوٹیوں کو سرکرنے کے لئے اورگھاٹیوں میں سفرکرنے کے لئے قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر کے علاوہ، علم تقابلِ ادیان، فلسفہ وحکمت اورقدیم وجدید ادبیات سے مکمل آگاہی انتہائی ضروری ہے۔ اسی علمی سرمائے کے بل بوتے پر فکرِ اقبالؒ تک رسائی ممکن ہے۔

ڈاکٹر محمد وسیم انجم اقبالیات کے نہ صرف طالبعلم رہے ہیں بلکہ اقبالؒ اوراس کے فکرو فن سے ان کی وابستگی بطورِ مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ وہ ایک منجھے ہوئے محقق کی تمام خوبیوں کا پیکر ہیں۔ انہوں نے اقبالؒ کے افکار کا مطالعہ سرسری انداز میں نہیں کیا بلکہ زیرِ نظر کتاب میں جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے وہ منفرد اور قابلِ توجہ بھی تھے۔ اپنی پہلی کتب کی طرح زیرِ نظر کتاب میں بھی اقبالؒ کے فکروفن کو مختلف حوالوں سے جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیشمار کتب کے تنقیدی اور تحقیقی نقطہ نگاہ سے مطالعہ کے بعد انہوں نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر وسیم انجم کا ایسے تحقیقی اور علمی موضوعات پر حاوی ہوکر ان کی تشریح وتعبیر کرنا ان کے اختصاصِ علمی کا ثبوت ہے۔ ان کا تشریحی اور تحقیقی اندازِ بیان ہر نوع کے قاری کیلئے قابلِ قبول اور قابلِ فہم ہے۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے اقبالؒ کے خیالات کی روح کو کسی جگہ مجروح نہیں ہونے دیا۔ یہ کتاب آٹھ مختلف النوع ابواب پر مشتمل ہے لیکن ڈاکٹر محمد وسیم انجم کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے سحر نگاری کے بجائے انتہائی مدلل اورجامع انداز میں پورے حوالہ جاتی پس منظر کے ساتھ ہرایک

موضوع سے انصاف برتنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے موضوع کو انتہائی پراعتماد طریقے سے آگے بڑھاتے ہیں اور جزیات کو انتہائی جامع اور موضوع کی مناسبت سے بیان کرتے جاتے ہیں۔ کتاب کی اہمیت و عظمت پر کچھ لکھنا میرا منصب نہیں تاہم میں جستہ جستہ اس کے مندرجات پر بات کروں گا تاکہ قارئین دل جمعی کے ساتھ اس کتاب سے لطف اندوز ہو سکیں۔

مابعد الطبیعیات

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اقبالؒ کے افکار میں ''مابعدالطبیعیات'' کی تلاش و جستجو ناممکن ہے۔ لیکن اقبالؒ کے فکروفن کے تشکیلی عناصر کا عمیق اور دقتِ نظر سے مطالعہ کرنے سے اور ان کے تمام تر فکری و فنی سرمائے کے تناظر میں دیکھا جائے تو اقبالؒ نے اس موضوع پر انتہائی بلیغ اور بھرپور انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے افتتاحی باب میں ڈاکٹر محمد وسیم انجم صاحب نے بڑی عرق ریزی اور غیر جانبدارانہ تنقیدی و تحقیقی دقتِ نظر سے اقبالؒ کے فکروفلسفے میں سے ان کے ''مابعدالطبیعیاتی نظریات'' کی تلاش و جستجو کی ہے۔ زیر مطالعہ کتاب کا مشکل ترین اور موضوع کے لحاظ سے وقیع ترین حصہ بھی یہی ہے۔

یہ حیرت خانۂ عالم جسے ہم کائنات کا نام دیتے ہیں اپنے اندر اعلیٰ درجے کا ربط و نظم رکھتا ہے۔ بغیر ربط و نظم کے وحدت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کائنات اسباب و اثرات کا ایک وسیع اور پیچیدہ طلسم ہے جو غیر محدود زمان و مکان میں پھیلا ہوا ہے اور طبیعی قوانین کا پابند ہے۔ انسان اس امر پر غور کرنے کے لئے مجبور ہے کہ جس دُنیا میں وہ سانس لے رہا ہے اس میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس حیرت خانۂ عالم کا خالق و مالک کون ہے؟ اس حیرت خانۂ عالم اور عالمِ طبیعی کو کس منصوبے کے تحت اور کس مقصد کی تکمیل کی خاطر معرضِ وجود میں لایا گیا ہے۔ انسان کا بے قرار دِل اس کائنات کی بےکراں وسعتوں اور لامحدود پنہائیوں کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس نظامِ تکوینی سے پرے اُس حقیقت کا کھوج لگانے کے لئے بھی بےچین رہتا ہے جس کے بغیر خود اس کا وجود ہستی کی لامحدود وسعتوں سے بےمعنی سا رہتا ہے۔ انسانی دِل غیر محدود اور لامتناہی کو سمجھنے کی گہری

لگن رکھتا ہے جس میں وہ تمام اوصاف عالیہ بدرجۂ اتم موجود ہوں جنہیں وہ خود اپنی ذات میں پیدا کرنا چاہتا ہے اور جس کی بدولت اُسے یقین و ایمان کے لازوال محرکاتِ عمل مل جاتے ہیں۔ اگر کائنات کی قدر و قیمت میں کوئی حقیقت ہے تو ضرور اس کا منبع و ماخذ ذاتِ باری تعالیٰ ہے جو قدروں کا سرچشمہ ہے اور جس کو تسلیم کیے بغیر انسانی زندگی انتشار میں مبتلا ہو جاتی ہے اور فطرت کی ابتدا و انتہا کا مسئلہ ایک لاینحل معمہ بن جاتا ہے۔ فطرت ''حضور'' ہے اور خودی کی پنہاں صلاحیتیں ''غیب'' ہیں جو ظہور میں آکر ''حضور'' بن جاتی ہیں۔ فطرت اور انسان کا تعلق اسی مسلسل عمل سے عبارت ہے اور حیرت خانۂ ایام کی بوقلمونی اسی کا نتیجہ ہے۔

زندگی از لذتِ غیب و حضور   بست نقشِ ایں جہانِ نزد و دُور

اسلام عرب سے نکل کر جوں جوں بیرونی دُنیا میں پھیلتا گیا اس پر مسیحیت، نوافلاطونیت، بدھ مت اور ہندو فلسفہ کے بعض عناصر اثر انداز ہوتے رہے، ان مکاتبِ خیال میں سے اس پر سب سے زیادہ اثر ''نوافلاطونیت'' کا پڑا جس سے اسلام کے سادہ اور عام فہم ''عقیدۂ توحید'' نے پیچیدہ اور عسیرالفہم ''وحدت الوجود'' کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس رنگ آمیزی کا آغاز دراصل تیسری صدی ہجری کے اولین دور میں حضرت ذوالنون مصریؒ (م ۲۴۵ھ) کی ذات سے ہوا۔ ان کے بعد حضرت بایزید بسطامیؒ (م ۲۶۱ھ)، حسین ابن منصور حلاجؒ (م ۳۰۹ھ)، ابوبکر شبلیؒ (م ۳۳۴ھ) وغیرہ نے بھی اس کے متعلق اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار کیا۔ لیکن اس وقت تک ''توحید'' کے سلسلے میں ''وحدت الوجودی'' رنگ اس قدر گہرا نہیں ہوا تھا۔ ساتویں صدی ہجری میں شیخ محی الدین ابن عربیؒ (م ۶۳۸ھ) نے اس مسئلہ کی تفسیر اور تشریح اس طرح کی کہ یہ تصوف اسلام کا ایک اہم ترین جزو بن گیا۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی علمی استعداد اور قابلیت سے اس مسئلہ کو اس قدر ہمہ گیر بنا دیا کہ دورِ مابعد کے صوفیا اور شعراء میں سے کوئی بھی اس کے اثرات کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ مصر، شام، ایران اور پاکستان و ہند کے صوفیاء اور شعراء کے دل و دماغ میں ''وحدت الوجود'' کا عقیدہ اس قدر وثوق کے ساتھ جم گیا کہ اس کے خلاف کسی بات یا رائے کو

سننے یا ماننے کو وہ تیار ہی نہیں ہوئے۔ اس نظریہ کو بعد کے آنے والے صوفیاء اور خصوصاً شعراء نے اپنی تعلیمات اور کلام میں جگہ دی۔ ایران اور پاک و ہند کے شعراء نے اس کے ہزاروں مضامین باندھے، جن سے عموماً بے عملی، ترکِ دُنیا، بے فکری، مبالغہ آمیز توکل اور قناعت، کشمکشِ حیات سے گریز اور خصوصاً نفی خودی کی تعلیمات وجود میں آئیں۔ صوفیاء کی تعلیمات تو خیر ایک خاص دائرہ میں محدود تھیں لیکن شعراء کے کلام سے ان منفی تعلیمات نے عوام الناس تک پہنچ کر انہیں بھی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ علامہ اقبالؒ نے جب مسلمانوں کی پستی و زوال کے اسباب و علل پر غور کیا، تو ان کو معلوم ہوا کہ اس کا ایک سبب بے عملی، جمود اور سکون ہے اور ان صفات کے علاوہ وہ منفی تعلیمات ہیں جو عقیدۂ ''وحدت الوجود'' اور نفی ذات کے فلسفہ سے وجود میں آئی ہیں۔ اس لئے انھوں نے اس عقیدے کے بانی افلاطون یونانی، اور اثرات کے لحاظ سے حافظ شیرازی پر اپنی تمام قوت صرف کر کے تنقید کی اور واضح طور پر بتایا کہ ان دونوں نے اپنی منفی تعلیمات کے ذریعہ سے ہماری قوم کو نقصان پہنچایا ہے۔

خدا اس طرح نظر آنے والی ہستی نہیں جس طرح کہ اور اشیاء نظر آتی ہیں۔ اس قسم کی دید کے لئے تو ''لن ترانی'' ہر کس و ناکس کے لئے ایک مستقل جواب ہے لیکن دید دو قسم کی ہے۔ ایک چشمِ بصارت سے اور دوسری وجدان اور چشمِ بصیرت سے۔ اصل دید یہی دو اقسام کی ہے اور اس کا امکان ہر مومن کے لئے ہر وقت موجود ہے، وہ مومن جس کی نسبت ''ہو ینظر بنور اللہ'' کہا گیا ہے۔ کسی حکیم صوفی کا قول ہے ''الحق محسوس والخلق معقول'' یعنی خدا تو براہِ راست چشمِ بصیرت کو محسوس ہوتا ہے البتہ خلق یا ما سوا کا موجود ہونا دلائلِ عقلی کا نتیجہ ہے۔ یہ جہاں جو ظاہر و باہر ہے دو آنکھوں پر دو انگلیاں رکھ دینے سے غائب ہو جاتا ہے لیکن معدوم تو نہیں ہو جاتا۔ زندگی کا اصل مقصد تو ''دیدِ دوست'' ہے اگر دیدِ دوست کا امکان نہیں تو ظاہری بصارت رکھنے کے باوجود انسان باطن کا اندھا ہے۔ عقل محرومِ یقین و وجدان کو سمجھانے کے لئے حیلہ گری کرتی ہے لیکن عقلی بحث خواہ کتنی دل آویز کیوں نہ ہو وجدانِ حیات کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ زندگی در اصل وجدانِ عقل

وحس سے ماورا ہے۔حقائقِ حیات کاادراک دوطرح سے ہوسکتا ہے۔ایک ذریعہ عقل وحکمت ہے اور دوسرا ذریعہ براہِ راست دید ہے جسے کشفِ حقیقت یا روحانی وجدان کہتے ہیں۔استدلالی حکمت گھر کے آستانے تک تو لے آتی ہےلیکن حلقۂ بیرونِ در ہی رہتی ہے۔ بقول اقبالؒ:

عقل گو آستاں سے دُور نہیں اس کی تقدیر میں حضور نہیں

طبیعی عالم کی ماہیت کے متعلق ہمارے خیالات کاانحصار اس پر ہے کہ ہم اس میں خود اپنی حیثیت کیا سمجھتے ہیں اوراس میں ہماری تقدیر کیا ہے؟ حیات وکائنات کی دوتوجیہات ممکن ہیں ۔ایک توجیہہ فطرت کے توسط سے اوردوسری ذہن کے توسط سے۔فطرت کے توسط کی رُو سے انسانی تاریخ ایک ادنیٰ سے سیارے پرادنیٰ درجے کے واقعات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور انسان محض اندھی اور بے مقصد طبیعی قوتوں کاایک کھلونا ہےاوربس...... ذہنی توجیہہ میں اصل حقیقت ذہن ہےاورعالمِ طبیعی اس کاعکس......انسانی ذہن خارجی اشیاء کاعلم حاصل کرتا ہے۔ان اشیاء میں اور ذہن میں اضافی تعلق ہوتا ہے۔اس نظریے کی رُو سے کسی خارجی شے کا علم اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہمارے ذہن کے ذریعے ہمارا حافظہ، تخیل اورقوتِ فیصلہ اس پراپنی اپنی مہرِ تصدیق ثبت نہ کردیں۔غرضیکہ عالمِ خارجی کا کوئی علیحدہ وجودنہیں بلکہ وہ ذہن کا کرشمہ ہےاوراسی سے وابستہ و پیوستہ ہے۔جو چیز شعور میں نہیں آئی اس کاوجود ہی نہیں۔فطرت کے میکانکی نظریے کے مطابق علم، حُسن واخلاق سے عاری ہے۔اس میں کوئی مقصد نہیں لیکن یہ نظریہ دوسرے مظاہرِ فطرت کے لئے چاہےکتنا صحیح کیوں نہ ہولیکن مظاہرِ حیات کواس کی مدد سے پوری طرح کبھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ نظریہ ذاتِ باری تعالیٰ کامنکر ہےاوروہ اس سے بھی انکار کرتا ہے کہ انسانی ذہن اپنی تشکیل کی قوت رکھتا ہے۔ وہ زندگی کی ایک اہم قوت یعنی رُوح کا بھی منکر ہے۔اس قسم کے تصورات ''ہمہ اوستی فلسفہ'' کی ایک شاخ بن جاتے ہیں ۔جس طرح عالم کی مادی توجیہہ میں غلو برتا گیا ہےاسی طرح ذہنی توجیہہ میں بھی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ انسان ایک طلسمِ بودونبود ہے جوبقولِ اقبالؒ نہ صرف رُوح ہےاور نہ صرف بدن بلکہ دونوں کا امتزاج ہے۔

رُوح وبدن میں دُوئی نہیں۔ انسان کی شخصیت میں دونوں کی وحدت جلوہ گر ہوتی ہے:

طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن

زمانہ صبحِ ازل سے رہا ہے محوِ سفر
مگر یہ اس کی تگ و دو سے ہو سکا نہ کہن

اگر ہو تجھے اُلجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انساں نہ رُوح ہے نہ بدن

اقبالؒ کے الفاظ میں ..... ''حیات کیا ہے؟ یہ فرد کا دوسرا نام ہے اور فرد کی اعلیٰ ترین صورت جو اس وقت معلوم ہو سکی ہے ''خودی'' یا ''ایغو (Ego) '' ہے۔ فرد جس قدر خدا کے نزدیک ہوگا اسی قدر کامل ہوتا جائے گا۔ قربِ الٰہی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہو جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لے۔ خودی محض ذہنی کیفیات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی قوتِ ناظمہ ہے اور انسان اپنی خودی کے ذریعے کائنات اور ذاتِ خُداوندی میں جو قدروں کا سرچشمہ ہے ایک طرح کا تعلق قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان کا مظہر ایک جسم ہے مگر حقیقت میں وہ ایک رُوح ہے جو جسم کے ہر ایک خلیہ میں بکمالِ حکمت وتدبر کارفرما ہے۔ آنکھوں کی بصارت رُوح ہی کی بدولت ہے مگر آنکھیں جو تمام خارجی مظاہر کو دیکھ سکتی ہیں اس رُوح کو نہیں دیکھ پاتیں جو بصارت کا سرچشمہ ہے۔ اپنی رُوح کا وجدان انسان کو براہِ راست اور بلاواسطہ حاصل ہے لیکن محسوسات پرست اس وجہ سے اس کے وجود ہی کے منکر ہیں کہ وہ کسی حس کا معروض نہیں۔ نہ اس کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس کو چھو سکتے ہیں، نہ ناپ سکتے ہیں اور نہ ہی تول سکتے ہیں۔ لہٰذا اس کا کوئی مستقل وجود ہی نہیں۔ ان کے نزدیک عناصر کی ترکیب اور تعامُل نے عضوی وجود پیدا کر دیا اور اس عضوی وجود میں رُوح ایسی ہی ہے جیسے ساز سے نکلنے والا نغمہ۔ جب ساز ٹوٹ جائے گا تو اس میں سے کوئی آواز نہ نکل سکے گی۔

اقبالؒ کے خیال میں اگر مسلمانوں نے ترقی کرنا اور آگے بڑھنا ہے تو ان کو اپنے عقائد، خیالات، تعلیمات اور عملی طور پر حیاتِ انسانی کے مثبت پہلو یعنی ''اثباتِ خودی'' کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا پڑے گا۔ اقبالؒ کی نظر میں انسان وہ بے مایہ قطرہ نہیں جو آخر کار دریا میں جا کر فنا ہو جائے بلکہ اس کی ہستی خود مستقل وجود کی حامل ہے اور انسان کی حیات کا مقصد اور نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ سے اپنے آپ کو متصف کر کے زیادہ سے زیادہ شانِ یکتائی اور انفرادیت پیدا کرے۔ اس کے لئے علامہ اقبالؒ نے عالمِ اسلام میں ''نظریہ خودی'' پیش کیا۔ علامہ اقبالؒ کا ''نظریہ خودی'' نئی چیز نہیں ہے بلکہ ان سے پہلے بھی اکابر صوفیاء نے اس کی تبلیغ و تلقین کی ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ (م ۲۹۷ھ) نے ''فنا'' میں مسلکِ ''سُکر'' کے برخلاف مسلک ''صحو'' اختیار کر کے، مولانا رومیؒ (م ۶۷۲ھ) نے ''وحدت الوجود'' کی طرف اپنا عام میلان رکھنے کے باوجود ''خودی'' کی تعلیم دے کر اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) نے شیخ محی الدین ابن عربیؒ (م ۶۳۸ھ) کے نظریہ ''وحدت الوجود'' کی تنقید اور تردید کر کے اور اس کے ردِ عمل کے طور پر نظریہ ''عبدیت'' پیش کر کے اس کی پُر زور حمایت کی ہے۔

واقعہ معراج زمان و مکان کی حقیقت اور اس کی مکمل تسخیر کا آئینہ دار ہے۔ جب انسانی رُوح فعلیتِ مطلقہ سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو ''زمان و مکان'' کی حقیقت اپنے سارے راز اس پر کھول دیتی ہے۔ معراج میں آنحضرت ﷺ نے کسی قسم کے مادی وسائل کی مدد کے بغیر ایک لمحے کے اندر ''مسجدِ حرام'' سے ''مسجدِ اقصیٰ'' اور پھر ''سدرۃ المنتہیٰ'' تک کی سیر فرمائی۔ اس روحانی سیاحت میں معلوم ہوتا ہے کہ تمام مادی قوانین معطل رہے۔ اقبالؒ کے نزدیک معراج زندگی کے حرکی اصول اور تسخیرِ جہات کا پیغام ہے جو آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کو دیا۔ اقبالؒ کی تمام شعری و نثری کتب میں اور بالخصوص ''جاوید نامہ'' میں اس واقعہ کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ انہوں نے اس واقعہ کو کس بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اسی طرح اسلامی علم الکلام میں جبر وقدر کا مسئلہ بھی انتہائی مشکل اور پیچیدہ تر رہا ہے اور یہ مسئلہ کبھی استدلال سے حل نہیں ہوسکتا۔ جبر اور قدر دونوں حقیقی ہیں لیکن ان کا باہمی تعلق ایک سربستہ راز ہے۔ انسان مختار بھی ہے اور مجبور بھی۔ لیکن اس خود مختاری اور مجبوری کی حدود کہاں تک ہیں اس کا تعین دشوار ہے۔ جس طرح قرآن اور حدیث میں جبر اور اختیار کے بارے میں آیات ملتی ہیں۔ اسی طرح اقبالؒ کے کلام میں بھی کہیں انسان مجبورِ محض دکھائی دیتا ہے اور کہیں مختار اور اپنے اعمال کا ذمہ دار...... عام طور پر صوفیاء جبری معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ ان میں سے اکثر وحدت الوجود کے قائل ہیں اس لئے مظاہرِ فطرت اور حوادث واعمال میں خدا کے سوا کسی ذات کو عاملِ موثر اور محرکِ حقیقی نہیں مانتے...... لا موجود الا اللہ – لا موثر فی الوجود الا اللہ۔ اقبالؒ کے ہاں بھی جا بجا وحدت الوجود موجود ہے اور اس کے ساتھ جو جبر وابستہ ہے اس کی تائید میں بھی اشعار ملتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اختیار کے بھی شدت کے ساتھ قائل ہیں۔ عقلی استدلال کو یہ تناقص معلوم ہوتا ہے لیکن نہ قرآن جبر و اختیار کو باہم متناقص سمجھتا ہے اور نہ اقبالؒ کے نزدیک اس میں تناقص ہے...... الایمان بین الجبر و الاختیار...... اختیار کے ثبوت میں بھی انہوں نے کئی دلائل اور مثالیں پیش کی ہیں۔ اقبالؒ نے اپنے عام ذہنی رجحان کے رنگ میں اس مسئلہ کا حل پیش کیا ہے۔ وہ زمانے کی تسخیر کو تقدیر پر قابو پانے کے لئے انتہائی ضروری سمجھتے ہیں۔

اسلام نے دنیا میں کفر کے مقابلے میں جو نظریہ پیش کیا ہے وہ آخرت میں انسان کا دوبارہ زندہ ہونا ہے، اور اُس کو اپنی زندگی کا حساب وکتاب دینا ہے جسے ''بعث بعد الموت'' کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا نظریۂ حیات تھا۔ جو اس سے قبل کسی نے پیش نہیں کیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی آفاقی تعلیم اس وقت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اس لئے کفارِ مکہ کے لئے یہ ایک عجیب، نیا اور انوکھا نظریہ تھا

۔وہ یہ گمان کرتے تھے کہ انسان جب مر جاتا ہے اور اس کو زمین میں دفنا دیا جاتا ہے، کسی حادثہ میں اس کی لاش دریاؤں میں بہہ جاتی ہے یا سمندر کی تہہ میں چلی جاتی ہے۔ جانوروں کے پیٹ میں چلے جانے یا جلا کر راکھ ہوا میں بکھیر دینے کے بعد انسانوں کو دوبارہ کیسے زندہ کیا جائے گا؟ روزمرہ کا مشاہدہ یہ بات ثابت کرتا ہے کہ آج جہاں قبرستان ہیں وہاں برسوں قبل آبادیاں تھیں۔ جہاں آج آبادیاں ہیں وہاں کبھی قبرستان تھے۔ بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ قبریں بوسیدہ ہو کر منہدم ہو جاتی ہیں اور ان میں کسی انسان کے اعضاء کا قطعی کوئی علم نہیں ہوتا بلکہ ہڈیاں تک خاک میں مل کر خاک ہو جاتی ہیں۔ ہزاروں سال پرانی قبریں تو بالکل نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ پھر ان میں دفن شدہ مُردوں کو کیسے زندہ کیا جائے گا؟ پھر انھیں کیسے جمع کیا جائے گا؟ یہ چند اشکالات ہیں جو ہر وقت لوگوں کے ذہنوں میں موجود تھے۔ مسلمان اگرچہ ''بعث بعدالموت'' پر ایمان رکھتے ہیں مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی شیطان یہ بات وسوسہ کے طور پر اُن کے دِل میں ڈالتا ہے۔ دوسری زندگی کا تصور عجیب ہے جس کے متعلق بہت سے سوالات ہو سکتے ہیں مثلاً: (۱) انسان کو کس کیفیت کے ساتھ زندہ کیا جائے گا؟ (۲) آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ لوگ زندہ ہوئے ہوں جس سے معلوم ہو کہ بعث بعدالموت ہے۔ یوں تو ''بعث بعدالموت'' کے بہت سے عقلی اور نقلی دلائل قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ مگر سب سے اہم چیز جس کو عقلِ انسانی بھی تسلیم کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اِنسان دُنیا میں دو طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک امیر دوسرا غریب، ایک ظالم دوسرا مظلوم ......اگر دُنیا میں ایک اِنسان ساری زندگی فاقہ کشی کی زندگی بسر کرے، فاقہ کشی میں ہی اس کو موت آجائے جبکہ دوسرا شخص عیش و عشرت کی زندگی بسر کرے اور اِس کا کوئی حساب و کتاب بھی نہ ہو اور اُس فاقہ کش کی دلجوئی بھی نہ ہو۔ ظالم ہمیشہ ظلم کرتا رہے اس کو روکنے والا کوئی نہ ہو اور مظلوم ہمیشہ مظلوم رہے تو انصاف نہ ہو گا۔ جن لوگوں نے دُنیا میں اچھے کام کئے ہوں ان کا بدلہ نہ ملے، بُرے کام کرنے والوں کو ان کی برائی کا بدلہ یا سزا نہ ملے تو یہ بھی انصاف کا تقاضا نہیں۔ ضروری تھا کہ تمام قسم کے اِمتیازات ختم کر کے مساوات قائم کی جائے۔ بغیر کسی کے ذاتی قسم کے رُعب

وہ یہ کہ عدل و انصاف کی میزان قائم رکھ کر سب کے حقوق دِلائے جائیں۔ جس طرح انسان دُنیا میں اپنے تحفظ اور حقوق کی خاطر عدالت سے رجوع کرتا ہے اُسی طرح سب سے بڑی عدالت بھی لگے گی۔ دُنیا میں انصاف کی راہ میں حائل لوگ وہاں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور ہر ایک انسان کو انصاف ملے گا۔ ایک دِن ایسا بھی ہونا چاہیے جس دِن تمام انسانوں کے خفیہ بھید ظاہر ہوں اور دُنیا میں وہ جو عمل بھی کرتے رہے ہوں اُن کی جزا و سزا پائیں۔

دوسرا طریقہ دلائلِ نفسی کا ہے۔ قرآنِ مجید نے اس بات کو دو طرح کے دلائل سے واضح کیا ہے۔ دلائلِ نفسی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی تخلیق پر غور و فکر کرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عناصرِ اربعہ سے مرکب کر کے ڈھانچہ بنایا اور اس میں رُوح پھونکی۔ آدمؑ سے پہلے دنیا میں کوئی موجود نہیں تھا۔ بغیر نمونہ کے اس کی تخلیق فرمائی۔ اب انسان کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟...... کیا اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) عاجز آ گئے؟ ہرگز ہرگز ایسا نہیں، بلکہ جس نے پہلے پیدا کیا وہ دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ فرمایا "منھا خلقنٰکم وفیھا نعیدکم......" (ہم نے انسان کو پیدا کیا، پھر موت کے بعد اس کی طرف لوٹایا جائے گا، پھر دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔) گویا اللہ تعالیٰ انسان کو دعوتِ فکر دے رہے ہیں کہ تجھے پہلے کس نے کس چیز سے پیدا کیا؟ ذرا پیدائش پر غور کر "......ایحسب الانسان ان یترک سدیً......" (القیامہ ۳۶،۴۰ پارہ ۲۹)۔ اس آیت میں واضح فرمایا گیا کہ انسان کو ایک حقیر چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کو عَلَقہ پھر مُضغہ بنایا پھر انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو "لقد خلقنا الانسان فی اَحسن تقویم" پیدا کیا۔ یہ تمام مخلوقات سے حسین وجمیل پیدا کیا گیا ہے۔ کیا اس نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ اس کو ایسا پیدا کیا جائے؟ ہرگز نہیں...... ایسا کسی انسان نے نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی مرضی سے حسین وجمیل پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اُن تمام حواسِ ظاہرہ اور حواسِ باطنہ سے نوازا جو انسانی زندگی کے لئے ضروری تھے۔ ان تمام مراحل میں کسی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ سارے مراحل اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی کے مطابق طے کروائے۔ کیا

انسان کو وہ دوبارہ زندہ کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا؟ کیوں نہیں وہ اس پر قادر ہے۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے پیدائش انسان کے سلسلے کو مرد اور عورت کے باہمی اختلاط سے جوڑا ہے لیکن یہ ایک واحد ذریعہ نہیں ہے بلکہ اس نے دُنیا میں بغیر ماں باپ کے بھی انسان پیدا کیا۔ حضرت آدمؑ کو بغیر ماں باپ پیدا کردیا تاکہ معلوم ہو" ......اذا اراداللہ شیئا ان یقولہ کن فیکون "۔ وہ جب کسی امر کا ارادہ کرتا ہے تو لفظ "کن" سے تمام چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتے ہیں "ان مثل عیسیٰ عنداللہ کمثل آدم (آلعمران ۵۹ :پارہ ۳)۔ لفظ کن سے آدمؑ پیدا کیا۔ بغیر باپ کے عیسیٰؑ کو پیدا کر کے بتا دیا کہ اللہ رب العزت کے سامنے کوئی مشکل نہیں ہے کہ انسان کو قیامت میں دوبارہ زندہ نہ کیا جا سکے۔ دُنیا میں انسان جس ماحول میں رہ رہا ہے اس کے ساتھ کرۂ ارضی میں بہت سی دوسری مخلوقات بھی رہ رہی ہیں۔ ان تمام مخلوقات کی ضروتوں کو اللہ تعالیٰ ہی پورا کر رہے ہیں۔ پھر ان سے انسان کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ اگر اس نظام میں انسان غور کرے تو پتہ چلتا ہے کہ تمام مخلوقات میں اپنی مرضی سے اللہ تعالیٰ تصرف فرماتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی اس کارخانۂ قدرت میں دخل نہیں رکھتا۔ ارشادِ ربانی ہے "لوکان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا"۔ اگر اس زمین و آسمان میں فساد نہیں ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ اسے اختیار حاصل ہے کہ وہ اس کارخانۂ قدرت کو مٹا کر دوبارہ بنا لے۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کے بانی ہیں جیسا کہ بہت سی آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہے۔ پھر اس کائنات کے بانی کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق کو ازسرِنو دوبارہ پیدا کرے اور جیسے یہ کائنات بنائی تھی دوبارہ ایسی ہی بنا سکے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جمے ہوئے خون سے بغیر نمونے کے پیدا کیا۔ دوبارہ اس کو پیدا کرسکتا ہے۔ اس کے اندر رُوح اصل ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ کردیا۔ رُوح کو موت نہیں آتی بلکہ موت تو جسم پر واقع ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں چند واقعات ذکر فرمائے ہیں جن سے "بعث بعد الموت"

کو ثابت کر دیا اور مُردوں کو دوبارہ زندگی بخشی گئی۔ سورۂ البقرہ میں ذکر ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص قتل ہوا۔ اس کا قاتل معلوم نہ ہو سکا۔ وہ حضرت موسیٰ کے پاس آئے اور کہا کہ اس کا قاتل بتائیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ آپؑ نے حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کی جائے اور اس کا گوشت اس مُردہ پر رکھ دیں، یہ زندہ ہو کر اپنا قاتل بتائے گا۔ بہت سے سوالات کے بعد انھوں نے گائے تلاش کی اور بھاری معاوضہ دے کر اس کو ذبح کیا۔ وہ مُردہ زندہ ہوا اور اس نے اپنا قاتل بتا دیا، اگرچہ وہ معلوم کرنے کی خواہش نہ رکھتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد ہے ''وا ذقتلتم نفسا زادرءتم فیہا'' (البقرہ ۷۲،۷۳: پارہ ۱)۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مُردوں کو اسی طرح زندہ کریں گے۔ اس ایک شخص کی زندگی میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ۶۱۰ برس قبل بخت نصر نے ملک شام پر حملہ کیا۔ اس نے حضرت دانیالؑ اور حضرت حزقیلؑ کو بھی قید کر لیا۔ بیت المقدس کے شہر کو جلا کر مسمار کیا۔ تورات کا نسخہ جو بیت المقدس میں تھا اس کو آگ میں جھونک دیا۔ ہزارہا بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا گیا۔ ہزارہا کو تہہ تیغ کیا گیا۔ ستر برس یہ شہر اور مسجد اجڑی رہی اور ستر برس بنی اسرائیل بابل میں قید رہے۔ جب بخت نصر مرا تو ایران کے بادشاہ خورس نے دوبارہ یہودیوں (جن کی تعداد ۴۰ ہزار تھی) کو بمع سامان بیت المقدس بھیجا۔ وہ آئے اور اپنے شہر کی حالت کو دیکھ کر آنسو بہائے۔ اس واقعہ کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کی آیت ''او کالذی مرعلی قریۃ ......'' (البقرہ ۲۵۹: پارہ ۳) میں کیا ہے۔ وہ شخص جو اس بستی سے گزرا جو چھتوں سمیت گری ہوئی تھی اس کو دیکھ کر اس کی ویرانی پر حسرت سے کہا کہ اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ کیسے آباد کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک سو برس تک مردہ رکھا پھر اس کو جگایا۔ اور پوچھا آپ کتنا عرصہ رہے ہیں۔ عرض کیا کہ اے اللہ! ایک دن یا ایک دن سے بھی تھوڑا رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ایک سو برس یہاں رہے ہیں۔ پھر فرمایا کہ پانی اور کھانے کو دیکھیں وہ اتنا عرصہ رہنے کے باوجود خراب نہیں ہوئے۔ پھر اپنے گدھے کی طرف دیکھیں جو بالکل سڑ گیا ہے پھر اس سامنے گدھے کو زندہ کیا اور موت

کے بعد والی زندگی کی حقیقت کو اُجاگر کیا ۔ اللہ تعالیٰ چاہیں تو قیامت کے دن ایسے ہڈیوں کو جوڑ کر ڈھانچہ بنائیں گے پھر اس پر گوشت چڑھائیں گے ۔قرآنِ مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ آیا ہے ۔جس میں انھوں نے اللہ تعالیٰ سے وہ کیفیت دریافت فرمائی ،جس سے قیامت میں انسانوں کو زندہ فرمائیں گے ......عرض کیا۔ " رب ارنی کیف تحی الموتی "(البقرہ ۲۶۰:پارہ۳) اللہ وہ کیفیت مجھے دکھادے کہ مُردوں کو کیسے زندہ کریں گے ۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا ایمان نہیں ؟......اے اللہ! اطمینانِ قلب چاہتا ہوں ...... اللہ تعالیٰ نے فرمایا چار مختلف پرندوں کو پکڑیں اور اپنے ساتھ مانوس کریں پھر ان چاروں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو ملا دیں ۔ پھر چار پہاڑوں پر رکھ کر ان کو اپنی طرف بلائیں وہ آپ کی طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے......آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اِن کا گوشت اور ہڈیاں کس طرح ایک دوسری سے ملتی ہیں ......پھر وہ کیسے زندہ ہو جاتے ہیں ۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یقین کامل تھا وہ تو محض اُس کیفیت کو ظاہر کرنا چاہتے تھے تا کہ وہ لوگ جو اس کے قائل نہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں ۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اصحاب کہف کا واقعہ ذکر فرمایا ہے ۔ یہ واقعہ عرب میں زبان زدعام تھا ۔ بچہ بچہ اس کو جانتا تھا اور لوگ نسل در نسل اس واقعہ کو یاد رکھتے تھے ۔ اوہ اپنے بچوں کو یہ واقعہ اکثر سناتے تھے ۔ چنانچہ اس کی پوری تفصیل بتلائی کہ اللہ تعالیٰ ۳۰۰ برس بعد انسانوں کو زندگی بخش سکتا ہے تو کیا قیامت کے دن اس کے لئے مخلوق کو دوبارہ زندہ کرنا مشکل ہے ۔

ان دو قسم کے دلائل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دِن انسانوں کو ضرور زندہ فرمائیں گے ۔ پھر اُن سے اُن کی زندگی کا حساب وکتاب لیں گے ۔الغرض قرآنِ مجید مختلف دلائل اور واقعات بیان کر کے ''بعث بعد الموت'' کو ثابت کر رہا ہے ۔اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی واضح فرمائی کہ جس طرح پہلے لوگوں کو اتنا عرصہ زندہ رکھنا اُس کے اختیار میں ہے اسی طرح دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟ اسلامی فلسفے میں ''حیات بعد الموت'' ایک مسلّم اُصول رہا

ہے اِس لئے اسلامی فکر خودی کے محدود اِمکانوں اور روحانی آزادی کی علمبردار رہی ہے۔ ہم مرنے کے بعد اس منزل سے اپنا سفر شروع کرتے ہیں جس منزل پہ ہم نے دُنیا میں اُسے چھوڑا تھا۔ ہمارے روحانی ارتقاء کا تسلسل بے خلل باقی رہتا ہے۔ جو اِس دُنیا میں روحانی لحاظ سے محروم رہا وہ آخرت میں بھی محروم رہے گا...... ''من کان فی ھذہٖ اعمیٰ فھو فی الاخرۃ اعمیٰ و اضل سبیلا ......''۔ جسم کی موت حقیقت میں موت نہیں بلکہ ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک موت صید ہے جس کی تاک میں انسان کو بیٹھنا چاہیے تاکہ ہستی کا ارتقاء رُکنے نہ پائے:

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید
مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

اقبالؒ کی نظر میں موت خواب کے پردے میں زندگی کا پیغام ہے۔ مرنے کے بعد بھی روحانی وجود برقرار رہتا ہے۔ اِنسانی وجود کا مرکز اس کی رُوح ہے جو ذاتِ الٰہی کی طرح لازوال ہے۔ موت عالمِ معنی کے سفر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر

اسلامی عقیدے میں موت شر نہیں۔ اگرچہ اس کی وجہ سے جو خوف وہراس کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ شر ہے۔ موت کے خوف میں ایک تو مٹ جانے کا خوف ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اعمال کی باز پرس ہوگی۔ مٹ جانے کا خوف زندگی کے بے معنی ہو جانے کا خوف ہے۔ ''حیات بعد الموت'' کے متعلق خالص مابعد الطبیعی دلائل سے شاید اِنسان کی کبھی پوری طرح تشفی نہ ہو سکے گی اور نہ اس کی نسبت اس کا عقیدہ استوار ہو سکتا ہے۔ اسلامی تاریخِ فکر میں ''ابنِ رُشد'' نے فلسفیانہ طور پر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی تھی لیکن بقولِ اقبالؒ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ اقبالؒ کے ہاں بعض جگہ یہ نکتہ بھی ملتا ہے کہ ''حیات بعد الموت'' مشروط ہے۔ صرف

وہی اشخاص مرنے کے بعد باقی رہیں گے جنہوں نے اپنی خودی کو مستحکم کرلیا ہوگا۔ اقبالؒ کے مابعد الطبیعی تصورات کا مرکزی نقطہ خودی ہے جس کے بے پایاں امکانوں کی اُنہوں نے پردہ کشائی کی ہے۔ خودی میں صرف کائنات کی تسخیر کی صلاحیتیں ہی نہیں ہیں بلکہ اپنے سب سے بڑے مدِ مقابل ''موت'' پر بھی قابو پانے کی قابلیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

اسلامی اور انسانی خلافت

اس باب میں ڈاکٹر محمد وسیم انجم نے اقبالؒ کے نثری و شعری سرمائے سے خالص اسلامی خلافت کے بارے میں مواد کو یکجا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اقبالؒ کے خطبات اور بالخصوص چھٹے خطبے، جاوید نامہ اور ایک مضمون (جو'' خلافتِ اسلامیہ'' کے نام سے ''مقالات اقبال'' میں بھی شامل ہے) کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ خلافتِ اسلامیہ پر علوم بشریات اور سماجیات کے عالموں نے اسلامی ادب میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ یہ ایک مستقل موضوع بلکہ فکر کی صورت اختیار کرگیا ہے۔ گوکہ خلفائے راشدینؓ کے بعد خلافت ملوکیت کی صورت اختیار کرگئی لیکن اسلامی بیداری کی تمام تحریکوں نے اسی خلافت کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جدوجہد جاری رکھی اور آج بھی مسلم اُمہ اسی خواب کی تعبیر کی متلاشی ہے۔

اقبالؒ کی تخلیقات اور نظامِ اشتراکیت

اشتراکی فلسفہ جدلی مادیت اور میکانکی تصورِ حیات پر مبنی ہے۔ اس فکر کا پہلا عنصر تاریخ کی مادی تعبیر ہے۔ کارل مارکس (جو اس فلسفہ کا باوا آدم کہا جاتا ہے) کے نزدیک کسی عہد کا معاشی نظام ہی اس عہد کی معاشرتی زندگی کی بنیاد ہے۔ مذہب، تہذیب، فلسفۂ حیات، فنونِ لطیفہ، سب

اسی کا عکس ہیں ۔اس کا دوسرا اُصول یہ ہے کہ ہر معاشی نظام جب ترقی کر کے ایک خاص منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض نئی پیداواری قوتیں نمودار ہو کر اپنے زمانے کے حالات پیداوار سے متصادم ہو جاتی ہیں، اس نزاع کو طبقاتی کشمکش کا نام دیا گیا ہے۔ ہر انقلاب اسی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ تیسرے اصول کے مطابق کسی شے کی قدر و قیمت کی اصل قدر محنت کی وہ مقدار ہے جو اُسے پیدا کرنے میں صرف ہو۔ چنانچہ اس شے کی قیمت کا واحد حقدار صرف مزدور ہے۔ چوتھے اصول کا تعلق ریاست سے ہے۔ اس کے مطابق ریاست ایک ایسا ادارہ ہے جس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دولت مند اور برسرِ اقتدار طبقوں کے مخصوص مفادات کی پاسبانی کرے۔ اشتراکیوں کے نزدیک جب محنت کش عوام ہی کی تخلیقی کوششوں سے تہذیب و تمدن کی آسائشیں وجود میں آتی ہیں تو تہذیب و ثقافت کی افادیت بھی اُن کے حصہ میں ہونی چاہیے ۔ جبکہ ادھر سرمایہ داروں کے نزدیک سرمایہ ہی ارتقاء اور فروغ کا باعث ہے اور جب مزدوری کا تعین ہو جاتا ہے تو مزدور کا کوئی حق باقی نہیں رہتا ۔ اشتراکی فلسفہ کے داعی ممالک نے خود ہی ان اصولوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں ۔ وہاں مزدور کو صرف ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائی جاتی ہیں اور باقی منافع ریاست کے نام پر جمع کر لیا جاتا ہے۔ تمام پیداواری ذرائع اجتماعی ملکیت قرار پاتے ہیں ۔

لیکن اسلام جو دینِ فطرت ہے اس میں نہ تو سرمایہ داری کے موجودہ تصور کی حمایت ملتی ہے اور نہ ہی اشتراکی معاشرے کی وہ رُوح نظر آتی ہے جس میں مذہب اور اخلاق کا کوئی مقام نہیں ۔ اسلام نے ذاتی ملکیت کی اجازت بھی دی ہے اور ساتھ ہی دولت کے ارتکاز کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ اسلام ذاتی ملکیت کی آڑ میں دوسروں کے استحصال کی ہرگز اجازت نہیں دیتا ۔ اسلام نے ارتکاز دولت کو روکنے اور تقسیم دولت کے لئے بیع، وراثت، صدقات اور زکوۃ کے اوامر نافذ کر دیئے ہیں ۔ دولت جمع کرنے والوں کے لئے قرآنِ مجید کی سورۃ توبہ میں اس طرح ارشاد ہوا ہے: (ترجمہ) اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کے راستے میں خرچ نہیں کرتے انہیں اس دن کے عذابِ الیم کی خوش خبری سنا دو، جس دن وہ مال دوزخ کی

آگ میں خوب گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پشت داغی جائے گی، یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، سو جو تم جمع کرتے تھے (سورۃ توبہ: ۳۵)۔

ناجائز ذرائع سے کمایا ہوا مال و دولت اگر خدا کی راہ میں خرچ بھی کیا جائے تو اس کی پذیرائی نہ ہوگی۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور سرور دو عالم ﷺ نے فرمایا ''......وہ آدمی جو حرام ذریعہ سے مال جمع کرتا ہے وہ خوش نہ ہو، اگر وہ اسے خیرات بھی کرے گا تو وہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی اور جو باقی رہے گا وہ جہنم کے لئے زادِ راہ ثابت ہوگا''۔

اقبالؒ نے اشتراکیت کے مکر وفریب اور تباہ کاریوں کو یورپ میں رہ کر نہ صرف قریب سے دیکھا بلکہ اسلامی تہذیب و ثقافت پر اس کے منفی اثرات کا بھی جائزہ لیا جس کی مثال ان کی نثری تصنیف ''علم الاقتصاد'' بھی ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کا اپنا ایک اقتصادی نظام ہے جو سرمایہ داری، اشتراکیت یا اشتمالیت سے بڑھ کر ہے، اس لئے اسلام اور سوشلزم کی پیوند کاری ایک غلط اور معیوب بات ہے۔ ڈاکٹر محمد وسیم انجم نے جو نظمیں منتخب کی ہیں ان کے علاوہ بھی اقبال کی تخلیقات میں بہت سی نظمیں اشتراکیت کی مذمت میں ملتی ہیں مثلاً، ارضِ ملکِ خدا است، خطاب بہ ملتِ رُوسیہ، کارل مارکس، ہیگل، ٹالسٹائی، مزدک، کوہکن، کومٹ، مردِ مزدور، قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور، شانِ دہقان، نوائے مزدور، لینن، گدائی وغیرہ میں اقبالؒ نے ہر لحاظ سے خالص اسلامی نقطۂ نگاہ سے اشتراکیت یا اشتمالیت پر بھرپور تنقید کی ہے۔ ڈاکٹر محمد وسیم انجم نے اس مقالے میں اشتراکیت کے بارے میں اقبالؒ کے خیالات کی بازیافت کی ہے۔

اقبالؒ کا خطبۂ پنجم اور ثقافتِ اسلامی کی اساس

کتاب کے چوتھے مقالے میں اسلامی ثقافت کی اساس اور اقبالؒ کے خطبۂ پنجم کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اقبالؒ کے خطبات اسلامی اور مغربی حکمت کا نچوڑ ہیں اور ان خطبات کو ایسا ''شاہکار'' کہا جا سکتا ہے جس میں اس زمانے کے اہم افکار کو اسلامی حکمت کے حوالے سے اور اسلامی حکمت کے بعض نمایاں مسائل کو مغربی افکار کی روشنی میں دیکھا گیا ہے۔ اقبالؒ کی شاعری

کی بات جدا ہے اس میں جو افکار پیش کیے گئے ہیں ان میں ایک عنصر شاعرانہ تخیل اور اسلوب کا بھی ہے جو قاری کو خارجی شعری لباس کی بنا پر سامانِ انبساط مہیا کرتا ہے لیکن خطبات میں ہر بات علم کی اصطلاحوں میں ایک معین منطقی اور سائنسی اسلوب میں ادا ہوئی ہے جس کی وجہ سے ان کی تشریح تو درکنار محض سمجھ لینا ہی مشکلات سے خالی نہیں۔ ڈاکٹر وسیم انجم صاحب نے ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' میں پانچویں خطبے کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ جس میں اسلامی ثقافت کے بارے میں اقبالؒ نے بڑے مدلل انداز میں اپنا نقطۂ نظر بیان فرمایا ہے۔ اس کا مرکزی نقطہ اسلامی نظامِ حیات اور اسلامی ثقافت کے خدوخال کا خالص فلسفیانہ انداز میں تجزیہ ہے۔ اسلامی نظامِ حیات کی عمارت کا بنیادی ڈھانچہ جن عقائد، اُصولوں اور ضابطوں پر اُستوار ہے ان میں سے چند ایک کا تفصیلی ذکر اور اس کے معاشرتی لحاظ سے افادی پہلوؤں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اختیارات میں کسی کو ذرہ برابر بھی شریک نہ کرنا توحید ہے۔ اس کا زبانی اقرار کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ تصدیقِ قلبی بھی ضروری ہے۔ جس کا اظہار انسان کے افعال واعمال سے ہوتا ہے۔ توحید اور شرک دو متضاد الفاظ ہی نہیں بلکہ ایمان وگمان اور کفر وایمان کی علامتیں ہیں۔ اس لئے عقیدۂ توحید کے لئے ''اقرار باللسان وتصدیق بالقلب'' کی شرط عائد کی گئی ہے۔ توحید کے بعد رسالت کا مقام آتا ہے۔ اس لئے کہ توحید کا صحیح تصور رسالت ہی کی وساطت سے انسان کو ملا ہے۔ اللہ نے اپنی اطاعت کو نبی مکرم ﷺ کی اطاعت کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔ اس لئے شرک فی رسالت کی گنجائش بھی ہرگز نہیں اور ایسا کرنا ناقابلِ معافی جرم بھی قرار پایا ہے۔ اسلامی زندگی میں عدل ومساوات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسلامی معاشرے میں کسی کو بھی اس کے بنیادی انسانی حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اور کسی کو بھی اس کے جائز حق سے زیادہ سے نوازا نہیں جا سکتا۔ نیز حق کی ادائیگی میں کالے، گورے، عربی، عجمی، امیر و غریب، چھوٹے اور بڑے میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ یہ بھی یاد رہے کہ مساوات حقوق کی ادائیگی میں ہوتی ہے حقوق کے تعین میں نہیں۔ عدل اور مساوات اسلامی نظامِ حیات کی وہ بنیادی

خصوصیات ہیں جنہیں دیگر تمام مذاہب بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بہت سے امور میں اس کی تقلید پر مجبور ہیں۔ اسلامی معاشرہ افراد کو ایک ایسی لڑی میں پرو دیتا ہے کہ وہ ایک کنبے کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ اس کنبے کا ہر فرد دوسرے کے لئے ویسے ہی دلی احساسات رکھتا ہے جیسا کہ وہ اپنے سگے بھائی کے لئے محسوس کرتا ہے۔ یہاں تک کہ لونڈی، غلاموں، نوکر چاکر، امیر اور غریب سب کو بطور مسلم برابری کی سطح پر حقوق عطا کرتا ہے۔ جس معاشرے میں دوسرے کے لئے ہمدردی اور ایثار کا جذبہ موجزن ہو وہ معاشرہ ہر لحاظ سے فلاحی، مہذب اور ترقی یافتہ گنا جاتا ہے اور اسلامی معاشرے کی یہ ایک اور امتیازی خصوصیت ہے کہ اس میں ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے لئے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اس کے افراد دوسرے کے لئے ایثار اور قربانی کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں۔ جس کی کئی ایک مثالیں تاریخ کے سنہری ابواب میں موجود ہیں۔ اسلامی معاشرہ میں بے جا نمود و نمائش، جاہ و جلال اور دولت کے بے جا اسراف کی اجازت نہیں۔ اسلام نے انتہائی سادہ و پاکیزہ معاشرتی ڈھانچہ تشکیل دیا ہے۔ جس میں سادہ لباس، سادہ خوراک، سادہ رہائش اور سادہ طرز زندگی کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی طرح خیالات، لباس، جسم اور رزق کی پاکیزگی کا درس دیا گیا ہے۔ اسلامی معاشرے کے افراد سادگی اور پاکیزگی کا نمونہ ہوتے ہیں۔ اسلامی معاشرہ میں اخلاق حسنہ کو اختیار کرنے اور اخلاق سیہ کو ترک کرنے کی بارہا تلقین آئی ہے۔ اچھے اور بہترین اخلاق والے لوگوں کو معاشرے میں دوسروں پر افضلیت دی گئی ہے

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اسلامی معاشرہ کی ایک بڑی خصوصیت تحمل، رواداری اور بردباری ہے۔ اسلامی معاشرہ میں ہر مذہب، ملت اور عقیدہ کے لوگوں کے ساتھ انہی خصوصیات کے ساتھ پیش آنے کا درس ملتا ہے۔ مذہبی آزادی اور رواداری کے جذبے کے فروغ پر اسلام نے خاص طور پر زور دیا ہے۔ برداشت، امن، باہمی بھائی چارے اور رواداری کی فضا کو قائم رکھنے پر اسلام نے ہمیشہ زور

دیا ہے۔ایک دوسرے کی عبادت گاہوں اور مذہبی شعائر کا احترام کرنا اسلامی معاشرے کی ایک اور بڑی اہم اور امتیازی خصوصیت ہے۔تحمل، رواداری اور برداشت کے مادے کے فروغ پر عمل پیرا ہونے کی سب سے زیادہ تعلیم اسلامی معاشرہ دیتا ہے۔اسلامی معاشرت کی بنیاد اتحاد و تنظیم پر ہے۔جس میں نفاق و انتشار کی گنجائش نہیں ہے۔اسلام معاشرہ میں نظم و ضبط، اتحاد و اتفاق، استحکام اور یکجہتی پیدا کرتا ہے۔ اللہ رب العزت کی طرف سے فتح و نصرت اور تائید الٰہی ان معاشرتی خصوصیات اور خوبیوں کے فروغ کے لئے کوشش کرنے والے افراد کے شاملِ حال رہتی ہے۔اسلامی طرزِ زندگی کا اپنا ایک الگ تشخص ہے اور مسلم تہذیب وتمدن اور ثقافت کا ایک اپنا الگ تھلگ ڈھنگ اور انداز ہے۔اس معاشرہ میں کھانے، پینے، اٹھنے، بیٹھنے، گفتگو اور لباس......سب کے لئے جداگانہ اور منفرد انداز ہیں اور ایک اچھا مسلمان انہی منفرد اور اعلیٰ خصوصیات اور آداب کی بدولت پہچانا جا سکتا ہے۔اسلامی طرزِ زندگی انہی معاشرتی آداب، اُصولوں اور خصوصیات کا ایک حسین مرقع ہے۔ جو عالمِ انسانیت کو ایک مثالی، اسلامی اور فلاحی معاشرہ تشکیل دینے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔اقبالؒ بھی معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی طور پر مستحکم روایات کے حامل اسلامی معاشرے کی تشکیل کے حامی تھے۔

علامہ اقبالؒ کے مجموعۂ خطوط

علامہ اقبالؒ کے تمام تر نثری سرمائے میں سے ان کی شخصیت، فکر وفن اور سماجی تعلقات کے بارے میں اگر بہت سے پہلوؤں پر بیش قدر معلومات میسر آ سکتی ہیں تو وہ ان کے مکاتیب ہیں جو زندگی کے ہر مکتبۂ فکر اور اقبالؒ کے حلقۂ احباب کے نام لکھے گئے ہیں۔ان کی تدوین اور طباعت جن جن مراحل سے ہوئی اور جن جن شخصیات نے انہیں یکجا کر کے اس عظیم سرمائے کو محفوظ کیا ہے اس کی داستان کو تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نگاہ سے ڈاکٹر محمد وسیم انجم نے اس مقالے میں پیش کیا ہے۔ بہت سی فنی اور تاریخی فروگذاشتوں کے بارے میں تحقیقی مواد کو یکجا کرنے کا کام انہوں نے بڑی جانفشانی، محنت اور عرق ریزی سے سرانجام دیا ہے۔ مجھے یقین

ہے کہ مکاتیبِ اقبالؒ پر کام کرنے والے ''اقبالین'' کو اس مقالے سے بڑی مدد ملے گی۔

علامہ اقبالؒ اور تصورِ پاکستان

اس مقالے میں ڈاکٹر محمد وسیم انجم نے تاریخی شواہد اور تحقیقی شعور کے ساتھ تصورِ پاکستان اور مصورِ پاکستان کے بارے میں ایک بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ اقبالؒ ایک انقلابی شاعر تھے اور ان کی شخصیت میں بیک وقت ایک شاعر، مفکر، فلسفی اور مردِ مومن کی تمام خصوصیات ملتی ہیں۔ ۱۹۰۵ء سے قبل اقبالؒ بھی قوم پرست تھے اور اقبالؒ کی محبت، جذبۂ حب الوطنی سے بڑھ کر وطن پرستی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ پرانے دیوتاؤں کی پوجا کو باطل قرار دینے والے اقبالؒ خود وطن کی پوجا میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں ''ہمالہ'' اور ''ترانہ ہندی'' اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں جن میں وہ مادرِ وطن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
ہندوستاں لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھولے ہوئے ترانے دُنیا کو پھر سنا دیں

ترانہ ہندی میں وہ وطن کو ایک خوبصورت گلستان سے تشبیہ دیتے ہیں۔ وہ وطن کو نشانِ وحدت خیال کرتے تھے اور کسی قسم کی معاشرتی و مذہبی باتوں پر یقین نہ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب اختلافات کا سبق نہیں دیتا۔ ہندوستان کی فلاح و بہبود کو وہ مقدم سمجھتے تھے۔ اقبالؒ ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے اور دونوں اقوام کو مادرِ وطن کی اساس پر ایک قوم کی حیثیت سے متحد دیکھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے ان کے پاس ایک ہی فارمولا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی دیوی یعنی ہندوستان کی پوجا کریں لیکن ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں اقبالؒ نے

یورپ کا زحتِ سفر باندھا اور یہ سفر ان کیلئے وسیلۂ ظفر ثابت ہوا۔ اسی سفر نے ان کی کایا پلٹ دی اور ان کا اندازِ فکر بدل گیا اور فکر کی اس تبدیلی نے انہیں زندہ جاوید کر دیا۔ یورپ میں انہوں نے جغرافیائی، نسلی اور لسانی قومیت کے تاریک پہلوؤں کا بغور مطالعہ کیا تو ان کا ایمان مسلم قومیت پر پختہ ہو گیا۔ خوابیدہ مسلم بیدار ہوا اور اسلام کے اُس آفاقی نظریۂ حیات پر یقین کامل ہوا جس کے نزدیک کسی فرد کی جائے پیدائش یا جائے سکونت کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ کس طرح مسلم کہلوائے۔ اِنسان چاہے کسی نسل، خطے یا رنگ کا ہو وہ ایک دفعہ کلمۂ توحید کا اقرار کر کے مسلم قومیت کا ایک فرد بن جاتا ہے۔

عام طور پر چوہدری رحمت علی کو لفظ ''پاکستان'' کا خالق کہا جاتا ہے لیکن اگر تاریخی شواہد اکٹھے کئے جائیں تو چوہدری رحمت علی کا پمفلٹ ''Now or Never'' ۱۹۳۳ء میں سامنے آیا جبکہ علامہ اقبالؒ ۱۹۰۷ء سے اسلامی تصورِ قومیت کو بڑے تواتر اور مؤثر انداز سے پیش کرتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں اقبالؒ کی لکھی گئی ایک نظم ''وطنیت'' انتہائی اہمیت کی حامل ہے جس میں انہوں نے مسلمانوں کو ایک مِلّت کے طور پر پیش کیا۔ اسی طرح ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ میں دیئے گئے خطبے میں وہ اسلامی نظریۂ قومیت کی وضاحت فرماتے ہیں۔ کیم مئی ۱۹۲۷ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے صوبائی اجلاس میں اقبالؒ نے جو قرارداد پیش کی اس میں بھی واضح طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کے الگ اسلامی تشخص کو اُجاگر کیا گیا۔ اُنہوں نے اپنے خطبات میں واضح طور پر پاکستان کا تصور پیش کیا۔ اقبالؒ نے اپنے سب سے اہم خطبۂ الٰہ آباد (جو ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو پیش ہوا)، خطبۂ لاہور (جو ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو پیش ہوا) اور اس کے بعد وہ خطبہ جو ۱۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو نیشنل لیگ لندن میں پیش کیا، میں واضح طور پر ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیا۔ بہر حال اس لفظ کی تخلیق کے ضمن میں بھی علامہ اقبالؒ ہی کا فیضان تھا۔ اس سلسلے میں ''علامہ اقبالؒ کے خطوط بنام جناحؒ'' انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ علامہ اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ کو بتدریج مطالبۂ پاکستان کی طرف لائے، جسے قائدِ اعظمؒ نے خود بھی تسلیم کیا۔ قائدِ اعظمؒ کے بقول

''مسلم لیگ کی بڑی کامیابی تھی کہ اس کی رہنمائی (مسلمانوں کے) اکثریت اور اقلیت دونوں طرح کے صوبوں نے بالآخر قبول کر لی۔ اس کام کی انجام دہی میں سر محمد اقبالؔ کا بہت نمایاں حصہ تھا اگر چہ اس وقت یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں تھی......ان کی آراء بڑی حد تک خود میرے خیالات سے ہم آہنگ تھیں۔ ہندوستان کے سامنے جو آئینی مسائل درپیش تھے ان کا احتیاط سے مطالعہ کرنے کے بعد مجھے بھی اقبالؒ کی آراء نے آخر میں انہی نتائج تک پہنچا دیا......''۔مصورِ پاکستان کے حق میں اس سے بڑھ کر اور کیا تحسین ہو سکتی ہے۔

اقبالؒ کی اردو غزلیں اور غزل نما قطعات کا اسلوب

اس حصے میں اقبالؒ کے اردو اور فارسی منتخب کلام کا اسلوب و معنی کے اعتبار سے فکری تجزیہ کیا گیا ہے اور بالخصوص اقبالؒ کی غزلیات پر بات کی گئی ہے۔ اس کتاب میں اقبالؒ کے فنِ شاعری اور اسلوب و بیان کے حوالے سے یہ دلچسپ ترین حصہ ہے۔

فراق گورکھپوری اپنی کتاب ''اردو غزل'' میں لکھتے ہیں کہ ''غزل انتہاؤں کا ایک سلسلہ ہے (A Series of Climaxes) یعنی حیات و کائنات کے وہ مرکزی حقائق جو انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ تاثرات کی انہی انتہاؤں یا منتہاؤں کا مترنم خیالات اور محسوسات بن جانا اور مناسب ترین یا موزوں ترین الفاظ و انداز بیان میں ان کا صورت پکڑ لینا، اسی کا نام غزل ہے۔'' داغ دہلوی کے بعد اقبالؒ کی غزل نے اردو شاعری کے منظرنامے کو بدل کر رکھ دیا۔ اقبالؒ سے پہلے اُردو غزل میں فارسی اصطلاحات، علامات اور رموز کی آمیزش کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کا ورود ہو چکا تھا اور ہندی شاعری کے اسلوب و بیان کی مٹھاس کا اثر بھی یقیناً ہو چکا تھا۔ ولیؔ سے لے کر میرؔ تک علائم و رموز اور تشبیہات و استعارات کا محل استعمال ملتا ہے۔ پھر میرؔ سے لے کر غالبؔ تک غزل کا اگر ارتقائی جائزہ لیا جائے تو اس میں فلسفیانہ افکار کی آمیزش نظر آتی ہے اور دردؔ کے متصوفیانہ خیالات بھی اس میں شامل ہو چکے تھے۔ لیکن اقبالؒ نے اپنی غزل میں پرانے علائم و رموز شامل کر کے انہیں ایک نئی معنویت دی۔ انہوں

نے فارسی اردو غزل کے ارتقائی جائزے کے بعد دونوں زبانوں کے مقتدر اور نامور شعراء کا مطالعہ کیا اور غزل کو اس نقطۂ عروج پر لے آئے جہاں برصغیر کا اب تک شاید ہی کوئی شاعر پہنچ سکا ہو۔ انہوں نے غزل کو اتنی فکری بلندی عطا کی کہ وہ محض عورتوں کی بات چیت کے بجائے علم و عرفان کا وسیلہ بن گئی۔ اسی طرح اقبالؒ کی نظم کے بارے میں پروفیسر سید عابد علی عابدؔ ''اصولِ انتقادِ ادبیات'' میں لکھتے ہیں ''یوں تو بیسویں صدی میں بہت سے اچھے نظم نگار پیدا ہوئے لیکن وہ فردِ واحد جس کی ذات برصغیر ہندوپاکستان میں تمام جدید فکری تحریکات کا مصدر بن کر رہ گئی، علامہ اقبالؒ تھے۔ انہوں نے داغؔ اور اس کے معاصروں کی آغوشِ تربیت میں پرورش پانے کے باوجود زمانے کا ساتھ دیا۔''

پیامِ مشرق

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے بقول ''جاوید نامہ کے بعد اقبالؒ کی مشکل ترین تصنیف پیامِ مشرق ہے اور اس مشکل کی وجہ وہ حقائق و معارف ہیں جن کا تعلق افراد اور اقوام کی باطنی تربیت سے ہے''۔ یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں فلسفہ کے ادق مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں مابعد الطبیعیات سے متعلق علمی نکات کو پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں غزلیات ہیں جنہیں کتاب کا دلکش حصہ کہا جاتا ہے۔ چوتھے حصہ میں مغربی حکماء کے افکار پر تنقید کی گئی ہے اور آخری حصے میں حکیمانہ نکات کو ظریفانہ انداز میں، متفرق اشعار اور قطعات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اقبالؒ نے واضح طور پر کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب مشہور جرمن شاعر گوئٹے کی مغربی دیوان کے جواب میں لکھی گئی ہے اور اس کا مدعا اور مقصد ملتِ اسلامیہ اور بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کی باطنی اور ظاہری زندگی میں انقلاب برپا کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کتاب ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ'' کی تفسیر ہے۔ جس کے ذریعے اقبالؒ قوم کے ضمیر کی گہرائیوں میں تبدیلی یا انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔ زندگی کا مقصد و مدعا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان ہر وقت روحانی منازل عالیہ طے کرتا رہے۔

جب ایک مقام حاصل کر لے تو اس سے بلند ترین مقام کے حصول کے لئے کوشاں ہو جائے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ زندگی حرکت کا نام ہے۔ بقول اقبالؒ زندگی ذوقِ سفر کا دوسرا نام ہے۔ اقبالؒ کا فلسفۂ حیات یہ ہے کہ ''کہ منزل پیش من جز سنگ رہ نیست''۔

اقبالؒ شاعرِ فطرت بھی ہے اور اس نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں متعدد نظموں اور لاتعداد اشعار میں بظاہر معمولی پتنگوں، پرندوں، پھولوں اور کائناتِ ارضی کے دیگر مظاہر کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اقبالؒ مظاہرِ فطرت کو دیکھ کر تعمیری انداز میں زندگی کے اصل مقصد کی بات کرتا ہے۔ اقبالؒ نے بانگِ درا میں بھی جگنو پر ایک دلکش نظم لکھی ہے جس میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ ''کرمکِ شب تاب'' کے نام سے اقبالؒ نے دو نظمیں لکھیں جس کا لبِ لباب یہی ہے کہ ''انسان کو زندگی کے تاریک پہلو کے بجائے اس کے روشن پہلو پر نظر رکھنی چاہیے تا کہ زندگی میں تلخی کے بجائے شادمانی کا رنگ پیدا ہو سکے۔ وہی انسان بامراد ہو سکتا ہے جو اپنی ہستی کو بھول کر دوسروں کو فائدہ پہنچائے''۔ حیرت انگیز طور پر کچھ عرصہ بعد اقبالؒ کے خیالات میں ایک مثبت اور انقلابی تبدیلی دیکھنے میں آتی ہے کہ اس نے مظاہرِ فطرت کے بجائے دین کے بلند ترین حقائق کو اپنی فکر کا موضوع بنا لیا۔ غالباً فکر کی اس تبدیلی کی بدولت ہی اقبالؒ نے اسلام کے انقلابی اور مابعد الطبیعیاتی موضوعات پر غور و فکر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔

''خطاب بہ مصطفیٰ کمال پاشا ایدہ اللہ (جولائی ۱۹۲۲ء)'' ایک ایسی نظم ہے جس میں اقبالؒ نے مصطفیٰ کمال پاشا کو اس کی جرأت اور بہادری پر تحسین آمیز نذرانہ پیش کیا ہے۔ بلاشبہ مصطفیٰ کمال پاشا پندرہ سال تک ایک جابر اور مطلق العنان بادشاہ کی طرح ترکی پر بلاشرکتِ غیرے حکومت کرتا رہا لیکن اس نے جولائی ۱۹۲۲ء میں یونانیوں کے خلاف جارحانہ جنگ شروع کی تو دنیائے اسلام نے اس کی بھرپور انداز میں پذیرائی کی۔ اس جنگ میں ترکوں نے انتہائی بے سروسامانی کے باوجود بڑی پامردی سے اور محض اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر یونانیوں کا نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ انہیں پسپائی پر بھی مجبور کر دیا۔ جب مصطفیٰ کمال پاشا کی فوجوں نے اپنی قوت

بازو پر بھروسہ کرتے ہوئے مدافعت کے بجائے جارحانہ پیش قدمی کی تو اقبالؒ نے بھی دیگر مسلمانوں کی طرح اسے اپنا ہیرو تسلیم کرتے ہوئے یہ پیغام دیا:

اے بسا صید کہ بے دام بفتراک زدیم
در بغل تیروکماں، کشتۂ نخچیر شدیم
ہر کجا دید اسپ براں تاز کہ ما
بارہا مات دریں عرصہ بہ تدبیر شدیم

فریڈرک نیٹشے (۱۸۴۴ء-۱۹۰۰ء) جرمنی کا ایک ہنگامہ خیز فلسفی اور انقلابی انشاء پرداز تھا اس کی جامع ترین تصنیف ''بقول زرتشت'' ہے جس میں اس نے خودی اور فوق الانسان کا فلسفہ پیش کیا۔ نیٹشے فوق الانسان کی پُرجلال اور قاہرانہ صفات میں اس قدر مستغرق ہوا کہ خدا کو بھی ایک ہستیِ موہوم قرار دیا۔ بالفاظِ دیگر خدائے ذوالجلال کا منکر ہوگیا۔ اقبالؒ نے اس کے اسی ملحدانہ طرزِ فکر اور انشاء پردازی کا موازنہ کرتے ہوئے اس کے متعلق ایک شعر میں فرمایا:-

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اُس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

''مرقع چغتائی'' کے دیباچے میں اقبالؒ نے اپنے نظریۂ فن کے بارے میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ''کسی قوم کی روحانی صحت کا دارومدار اس کے شعراء اور آرٹسٹ کی الہامی صلاحیت پر ہوتا ہے لیکن یہ ایسی چیز نہیں کہ جس پر کسی کو قابو حاصل ہو۔ یہ ایک عطیہ ہے، جس کی خاصیت اور تاثیر کے متعلق اس کا پانے والا اس وقت تک تنقیدی نظر نہیں ڈال سکتا جب تک کہ وہ اُسے حاصل نہ کر چکا ہو۔ اس لئے عطیے سے فیض یاب ہونے والے کی شخصیت اور خود اس عطیے کی حیات بخش تاثیر انسانیت کے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی زوال پذیر آرٹسٹ کی تخلیقی تحریک اگر اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے نغمے یا تصویر سے لوگوں کے دل لبھا سکے، قوم کے لئے بہ نسبت اٹیلا یا چنگیز خان کے لشکروں کے زیادہ تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے امراالقیس

کے متعلق جو قبل اسلام کا سب سے بڑا عرب شاعر گذرا ہے، فرمایا تھا:

اشعر الشعرا و قائدھم الی النار

(یعنی وہ شاعروں کا سردار لیکن جہنم کی راہ میں وہی ان کا قائد ہوگا)

درج ذیل شعر کہتے وقت بھی یقیناً اقبالؒ نے نبی مکرمﷺ کی امرالقیس کے بارے میں رائے کو مدِ نظر رکھ کر نیٹشے کے بارے میں اپنی رائے پیش کی ہوگی۔ اقبالؒ نے اس شعر میں خالص فنی نکتۂ نگاہ سے اتنی جامع تنقید کی ہے کہ نیٹشے کی پوری زندگی اور اس کے فلسفے کا مکمل احاطہ کرلیا ہے جس سے اقبالؒ کے تنقیدی شعور کی بلندی اور شاعرانہ عظمت کا اندازہ بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

آنکہ بر طرحِ حرم بتخانہ ساخت

قلبِ او مومن دماغش کافر است

ایک اور جگہ اقبالؒ نے شوپن ہار اور نیٹشے کے فلسفہ کے بنیادی اصولوں پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ اقبالؒ نے نیٹشے پر تین نظمیں لکھی ہیں جس سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ اقبالؒ کو اس مجذوبِ فرنگی'' سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اقبالؒ کے خیال میں اس کے دور میں ایسا کوئی شخص نہیں تھا جو اُسے مقامِ کبریا سے آگاہ کرسکتا۔ اسی لئے اقبالؒ نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا:

کاش بودے در زمانِ احمدے

تا رسیدے بر مقامِ سرمدے

عالمی ادب کی زندہ جاوید ''مثنوی معنوی'' کے خالق عظیم صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومیؒ (۱۲۰۷ء - ۱۷ دسمبر ۱۲۷۳ء) کو ان کی اسی عہد ساز کتاب کی بدولت حیاتِ جاوداں اور عالمگیر شہرت ملی۔ چھ دفاتر پر مشتمل اس کتاب میں اشعار کی تعداد چھبیس ہزار چھ سو ساٹھ ہے۔ فارسی زبان کی جن چار کتابوں کو شہرہ آفاق کہا جاتا ہے ان میں شاہنامہ فردوسی، گلستانِ سعدی، دیوانِ حافظ اور مثنوی مولانا روم ہے۔ لیکن مثنوی کو جو شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی باقی تین

کتابیں اس مقام تک نہ پہنچ سکیں ۔اس کتاب کی ترکی، فارسی، انگریزی کے علاوہ اردو اور فرانسیسی میں شرحیں لکھی جا چکی ہیں ۔مثنوی معنوی کو پہلے پہل مخفی وملکوتی حقائق کا ایک بے مثال اظہار ہی سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا کہ مولانا جامیؔ جیسے بلند پایہ شاعر اور فلسفی نے اسے ''قرآن درزبانِ پہلوی'' قرار دیا۔پروفیسر فتح محمد ملکؔ کے بقول ''مطالعہ رومیؔ ہمارے لئے خالص علمی اور فنی مشغلہ نہیں بلکہ عملی اور باطنی زندگی کا ایک ناگزیر تقاضا ہے''۔پھر عہد اورنگزیب میں مثنوی کو مسلمانوں میں حیرت انگیز قبولِ عام نصیب ہوا اور یہ درس وتدریس کی اہم ترین کتاب قرار پائی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ شبلی نعمانیؒ نے مثنوی کو تصوف سے زیادہ جدید علم الکلام کا سرچشمہ قرار دیا۔پھر اقبالؒ کی آواز گونجتی ہے:

وقت است کہ بکشائم میخانہ رومیؔ باز

پیران حرم دیدم در صحن کلیسا مست

اقبالؒ رومیؔ کو ازسرِ نو دریافت کرتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے رومیؔ تاریخ کے زندان سے نکل کر اقبالؒ کے عہد میں سانس لے رہے ہیں، اقبالؒ کے دل میں دھڑک رہے ہیں اور صحبتِ پیر رومؔ سے اقبالؒ پر عصرِ حاضر کے پیچیدہ اسرار منکشف ہو رہے ہیں:

چو رُومیؔ در حرم دارم اذاں من

ازو آموختم اسرار جاں من

بہ دور فتنۂ عصرِ کہن او

بہ دور فتنۂ عصرِ رواں من

اقبالؒ گوئٹے کے اس حد تک معترف ہیں کہ اس کے ایک نامکمل ڈرامے کا مکمل حصہ ''جوئے آب'' کے نام سے ترجمہ کیا جو آنحضرت محمد ﷺ کی شان میں بھرپور قسم کی نعت پر مشتمل ہے۔وہ گوئٹے کے کمالِ فن کے نہ صرف معترف ہیں بلکہ اس کی تحسین بھی کرتے ہیں اور پیر رومیؔ کی زبان سے اس کے کمالِ فن کا اعتراف کرتے ہیں۔ڈاکٹر محمد وسیم انجم نے جو نظم منتخب کی ہے اس

میں جلال سے مراد مولانا جلال الدین رومیؒ کی ذات ہے جنہیں اقبالؒ مرشدِ معنوی اور پیرِ رومیؒ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

کتاب کی پیشکش سے اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ڈاکٹر محمد وسیم انجم نے اقبالؒ کے افکار کو سہل انداز میں پیش کرنے کی مخلصانہ اور دیانتدارانہ کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے مندرجات سے بہت سے ''فدایانِ فکر و فلسفۂ اقبالؒ'' کو مزید تحقیق و استفادے کے لئے نہ صرف رہنمائی ملے گی بلکہ بیشتر مسائل کا حل اور اشکالات کا جواب بھی میسر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر محمد وسیم انجم کو توفیق و حوصلہ عطا فرمائے کہ وہ ایسی بہت سی اور کتب بھی مدون و تصنیف فرماسکیں اور اللہ رب العزت ان کی اس مساعی کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے (آمین)۔

………………

دیباچہ……مطالعۂ اقبالیات از ڈاکٹر محمد وسیم انجم۔ ناشر: انجم پبلشرز، کمال آباد ۳، راولپنڈی: ۲۰۰۷ء۔

”زندہ رہے گا پاکستان“

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

آثارالصنادید کے دیباچے کا آغاز سرسیّد نے اس شعر سے کیا جس کا مفہوم کچھ یہ بنتا ہے کہ خواہ کھنڈرات ہی کیوں نہ ہوں گزرے ہوئے قافلے کے آثار محفوظ کر لینا چاہیں“ اسی طرح انہوں نے جب علامہ شبلی نعمانی کی کتاب ”المامون“ کا دیباچہ لکھا تو نہایت دردمندی کے لہجے میں کہا” یہ نہایت سچا مقولہ ہے کہ وہ قوم بڑی بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے کارناموں کو بھلا دے یا ان کو نہ جانے“۔ دونوں باتوں کو اگر ملا کر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ جو قوم اپنی تہذیب، روایات اور تاریخ سے واقف نہ ہو یا اسے محفوظ نہ رکھ سکے وہ کسی بھی لحاظ سے قابلِ تحسین نہیں ہوتی۔

علامہ شبلی اپنی مشہور و معروف کتاب ”الفاروق“ کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

”تاریخ لکھتے وقت دو باتوں پر نظر رکھنی چاہیے۔اول،”جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات درج کئے جائیں یعنی تمدن، معاشرت، معیشت، اخلاق، عادات، مذہب...... ہر بات پر پورا زور دینا چاہیے“۔دوم:”کوشش کرنی چاہیے کہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کو سلسلہ تلاش کیا جائے“۔

کرنل سید مقبول حسین نے ”زندہ رہے گا پاکستان“ میں ان دونوں باتوں کو پورا کر دکھایا ہے۔ اس کتاب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ ایک Eye Witness کے ذاتی مشاہدات پر مشتمل ہے کہ جس نے اپنے بچپن کے اس دور میں ہجرت کا کٹھن سفر طے کیا جب اس کے شعور اور لاشعور میں کھلونوں میں تمیز کرنا بھی مشکل تھا، چہ جائیکہ اپنا گھر بار، اپنے گلی کوچے، اپنے ننھے منے دوستوں اور ساتھیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا۔ وہ پاکستان

کے ساتھ ساتھ بڑا ہوتا گیا ..... پھر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں فتح کے نشہ سے لطف اندوز ہوا اور ۱۹۷۱ء میں شکست اس کا مقدر ٹھہری۔ حالانکہ یہ شرمناک شکست کسی بھی لحاظ سے افواج پاکستان کی شکست نہ تھی، بلکہ چند مخصوص لوگوں کی بچھائی ہوئی بساط پر بازی ہارنے کا ڈرامہ تھی۔ کرنل سید مقبول حسین جب جنگی قیدی بنے، تو وہاں انہوں نے ایک اور تجربہ حاصل کیا۔ وہاں سے وہ گہرے مشاہدے اور حالات وواقعات کی تفہیم کا ادراک لے کر لوٹے۔ بنگلہ دیش میں علیحدگی پسندوں سے نبرد آزما ہوئے تو ہمدرد متحدہ پاکستان کے حامی عناصر کو بھی لہو کا غسل کرتے دیکھا۔ اندورن ملک سیاسی شکست وریخت، مارشل لاء کے تینوں ادوار اور نام نہاد جمہوری حکومتوں کے اتار چڑھاؤ ..... سب کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کتاب کا ہر پیرا گراف قاری کو پاکستان کی تعمیر وتخریب میں شامل کرداروں کا ایک واضح اور مکمل پورٹریٹ دکھاتا ہے اور ہر ایک سطر قاری کو اسی کرب، دکھ اور احساس سے لذت آشنا کرتی ہے جس سے کرنل صاحب اوران جیسے بہت سے پاکستانی لوگ گزرے ہیں۔ ماضی اور مستقبل کے روشن اور تاریک گوشوں سے نقاب کشائی کرتے کرتے وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ کرنل صاحب اس کتاب میں پاکستانی قوم اور خاص طور پر نئی نسل کو ایک لمحے اگر یہ داستان سناتے ہیں کہ:

میں بچ کے پھر بھی نکل آیا گہرے پانی سے
اگرچہ لڑنا پڑا ہے مجھے بھنور کے ساتھ

تو دوسرے لمحے قاری سے یہ التجا بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں

اس کو گلشن میں ایستادہ کر
جو شجر بھی یہاں جھکاؤ میں ہے

ان کی نظم میں جتنا حسن اور وارفتگی ہے انہوں نے اپنی نثر میں اس سے کہیں زیادہ درد اور امیدیں بھر دی ہیں۔ اتنے بڑے اور وسیع کینوس پر پھیلی تاریخ کا احاطہ کرنا اور وہ بھی ۱۴۰ صفحات کی کتاب میں بہت مشکل ہے۔ ایک فن کار اور مؤرخ میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ

مؤرخ خاص اور انفرادی واقعات پیش کرتا ہے جب کہ ادبی فن کار کے ہاں عمومیت ہوتی ہے۔ اسی لئے فن کار کا رجحان عقل ودانش کی طرف ہوتا ہے۔فن کار اگرچہ مخصوص واقعہ یا مخصوص کردار پیش کرتا ہےلیکن اس کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ مخصوص حالات میں مخصوص قسم کے لوگوں کا کیا رویہ یا ردِعمل ہوتا ہےاور وہ کیسی باتیں کرتے ہیں۔اور کرنل صاحب نے بھی اپنی فنکاری کا بھرپور انداز سے مظاہرہ کیا ہے۔ یہ کتاب کسی بھی لحاظ سے تاریخ کی کتاب نہیں ہوسکتی۔اس میں یاداشتیں، مشاہدات، احساسات اور امیدیں بھری ہیں۔تاہم یہ ایک ایسی دستاویز ضرور ہے جس میں ایک سچے مسلمان اور دردمند پاکستانی کے جذبات کو نوکِ قلم پر لایا گیا ہے۔کرنل صاحب ایک واقعہ بیان کرتے ہیں پھر اس کا تجزیہ اور آخر میں قاری کے لئے ایک سوال کی صورت...... بہت کچھ سوچنے اور جاننے کا ایک متجسس اور روشن چراغ جلا کر آگے نکل جاتے ہیں۔یہی اس کتاب کی خوبصورتی ہے، جواسے ڈائری، یاداشت یا تاریخ کے علاوہ ایک ادبی مرقع بنا گئی۔دوران مطالعہ قاری تاریخِ پاکستان کو ایک تسلسل کے ساتھ چلتی فلم کی طرح اپنے سامنے محسوس کرتا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز نہیں لیکن تاریخ کے بننے اور بگڑنے کے کئی ایک مناظر اس میں اجاگر کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب نہ تو ہیروڈوٹس **Herodotus** کی تاریخ ہےاور نہ ہی ہومر کی شاعری، بلکہ اس میں ہماری پاکستانی تاریخ کے خدوخال کو ایک سلائیڈ شو یا **Presentation** کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔کتاب کا اختتامی پیراگراف امیداور یقین کے امتزاج سے کشید کیا گیا ہےاور یہی یقین اور امید کی دولت ہر دردمند پاکستانی کا سرمایہ حیات ہے۔یاد رہے کہ اس سے قبل ان کی شاعری کے دو مجموعے ''تپش'' اور ''دل خاموش سوالی سا ئیں'' شعروادب میں کافی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں اور زیرِ تبصرہ کتاب ان کی تیسری کتاب ہے۔

....

مطبوعہ: ماہنامہ ''فورم انٹرنیشنل'' جرمنی، اکتوبر ۲۰۰۰، صفحہ ۷۹، ۸۰

''نعت گویانِ سرگودہا''......شاکر کنڈان کی ایک اور سعادت

سرزمین سرگودہا کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ یہاں سے علم وعرفان کے سرچشمے پھوٹتے ہی رہے ہیں۔ بھیرہ اور تخت ہزارہ دو ایسے علاقے ہیں جن کی تہذیب وتمدن اور تاریخ قدیم ترین بھی ہے اور لازوال ہستیوں کا مسکن ہونے کا اعزاز بھی رکھتی ہے۔ دین و مذہب کی اشاعت و ترویج کے حوالے سے اس سرزمین میں ایسی نادرروزگار ہستیوں نے جنم لیا کہ جن کا ذکر کیے بغیر کوئی بھی مورخ اس سرزمین کی تاریخ کا مکمل احاطہ کرنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ مجھے اس وقت اسی علمی وادبی لحاظ سے زرخیز خطہ کے ایک نامور سپوت، شاکر کنڈان کی نئی تالیف ''نعت گویانِ سرگودہا'' کے حوالے کچھ کہنا ہے۔

شاعری بذاتِ خود ایک ایسا جوہر ہے جو ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا لیکن اگر دیکھا جائے تو حمد ونعت سے وابستگی کسی بھی شاعر کے لئے عطیۂ خداوندی ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو نبی اکرمﷺ کی تعریف وتوصیف کی ابتدا خود خالقِ ارض وسما نے کی ہے۔ قرآنِ پاک میں متعدد ایسے مقامات ہیں جہاں اللہ رب العزت نے آنحضورﷺ کی مدحت بیان فرمائی ہے اور اس انداز سے بیان فرمائی ہے کہ جیسے ایک محبّ نہایت والہانہ انداز میں اپنے محبوب کے گن گاتا ہے۔ کہیں آپﷺ کو ''رحمت اللعالمین'' کہہ کر آپﷺ کی صفتِ حسنہ کا اظہار فرمایا ہے تو کہیں ''خلقِ عظیم'' کے الفاظ میں آپﷺ کے ارفع واعلیٰ کردار کی ترجمانی کی ہے۔ کہیں ''سراجاً منیراً'' کا لقب عطا فرما کر آپﷺ کی ضیاء بار ہستی کو دائرہ نور میں لایا گیا ہے۔ اللہ رب العزت نے اپنے پیارے حبیبﷺ کے صرف گن ہی نہیں گائے ہیں بلکہ آپﷺ کے ذکرِ خیر کو ابدالآباد تک کے لئے عظمت وسربلندی کا موجب قرار دیا ہے۔ فرمایا ''وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ''......(اور ہم نے آپ کے لئے آپ کے ذکر کو رفعت وبلندی عطا کردی)۔ یہاں یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ خالقِ کائنات نے مذکورہ بالا آیتِ کریمہ کی بدولت صاحبِ لولاکﷺ کی سیرت مبارکہ سے متعلق ہر طرح کے ذکر کو رفعت وعظمت عطا فرمادی ہے۔ اور اس نوع کے ذکر مبارک میں ذکرِ

ولادت، ذکرِ معراج، ذکرِ معجزات، صلوٰۃ وسلام وغیرہ بھی شامل ہیں اور جب تک یہ دُنیا قائم ہے رسالتمآب ﷺ کا ذکرِ مبارک اسی رفعت وعظمت اور جذبۂ عقیدت کے ساتھ ہوتا رہے گا۔

سورۃ الاحزاب (آیت ۵۶) میں ہے کہ "خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر (ﷺ) پر درود بھیجتے ہیں، مومنو! تم بھی پیغمبر (ﷺ) پر درود وسلام بھیجا کرو"......قرآن پاک کی اس آیت سے نعت کی قدر وقیمت واضح ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں آنحضور ﷺ کا تذکرۂ جمیل دراصل وہ سرچشمۂ الٰہی ہے جس سے فنِ نعت نویسی کی جوئے خوش خرام نکلی ہے۔ آیاتِ ربّانی میں ذکرِ رسول ﷺ وہ آفاقی مدحت ہے جو نعت گوئی کی محرک بنی ہے۔ اس صنفِ سخن کو تاب وتوانائی آسمانی کتاب سے ملی اور پھر اس فنِ متبرک کی عظمت وسربلندی یوں دوچند ہو جاتی ہے کہ اسے خود سرورِ کونین ﷺ کی تائید حاصل تھی ......وہ کس طرح؟......

کفار ومشرکین کے شعراء اسلام اور رسولِ اکرم ﷺ کے خلاف اپنی سخنوری کے ذریعے جو زہر اگلتے تھے اس کا جواب دینے کے لئے آنحضور ﷺ شعرائے اسلام کی ہمت افزائی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک موقع پر حضرت کعب بن مالکؓ سے فرمایا:

"اُن کی ہجو کہو کیونکہ اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے تمہارا شعر ان کے حق میں تیر سے زیادہ تیز ہے۔"

حضرت حسان بن ثابتؓ سرزمینِ عرب کے بلند پایہ اور ممتاز شاعر تھے۔ انہوں نے ۶۰ برس جاہلیت کی تاریکی میں اور ۶۰ سال اسلام کی روشنی میں بسر کئے، اسلام لانے کے بعد انہیں سرِبارِ رسالت مآب ﷺ کے شاعر کہلانے کا عظیم اعزاز حاصل ہو گیا۔ آپ ﷺ مشرکین کے گستاخانہ کلمات کے جواب میں حضرت حسان بن ثابت کو مدافعت کے لئے یہ کہہ کر مامور فرماتے:......"تم مشرکوں کی ہجو کہو۔ بے شک جبرائیل تمہارے ساتھ ہیں"

ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے انہیں حکم دیا:

"اجب عنّی"......(میری طرف سے جواب دو)

اور پھر شاعرِ دربارِ رسالت کے لئے یہ دُعا فرمائی:

''اللھم ایدہ بروح القدس''......(ترجمہ: اے اللہ! جبریل کے ذریعے اس کی مدد فرما)۔ گویا نعتِ رسول ﷺ کہنے والا شاعر حضرت جبرائیل کے حصار میں ہوتا ہے۔

ہجرت کے وقت انصارِ مدینہ بھی نعت پڑھ رہے تھے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن زہیرؓ، حضرت عبداللہؓ بن رواح سمیت بڑے بڑے اکابر صحابہ کرامؓ نے نعت گوئی کی۔ حضرت حسان بن ثابتؓ نے ایک بار حضور اکرم ﷺ کے سامنے یہ نعت پڑھی: ۔ (ترجمہ)

''اس دُنیا میں آنے سے پہلے،
آپ ﷺ سایۂ خاص میں تھے۔
اور اس دُنیا میں،
جہاں پتوں سے تن ڈھانپے گئے۔
پھر آپ ﷺ اس جنت سے اُترے اور نبیوں میں پہنچے
حالانکہ ابھی آپ نہ بشر تھے نہ مضغۂ گوشت۔ نہ لہو کی بوند
بلکہ وہ۔ ماءِ مقطر جو کشتیوں پر سوار تھا،
پانی کی مد میں پہاڑوں کی چوٹیاں چوم رہی تھیں
باشندگانِ زمین ڈوب چکے تھے
یہ ماءِ مقطر حلب سے رحم کی طرف منتقل ہوتا رہا
ایک عام گزر جانے کے بعد سطحِ زمین اُبھری......
اور وہ احوال پیدا ہوئے،
جن میں جماعتوں نے ظہور پایا
آپ ﷺ نارِ خلیلؑ میں بھی اترے، نہاں نہاں۔
اُن کے حلب میں آپ ﷺ ہی تو تھے۔

پھر آگ سے وہ بھلا کس طرح جلتے
آپ ﷺ کی حفاظت آپ ﷺ کے محافظ گھرانے نے کی
جو خندق (۱) جیسی بلند مرتبہ خاتون کا ہے۔
وہ بلند مرتبہ خاتون کہ دامن اس کا قدموں میں لوٹتا تھا
اس کی یہ شان تھی۔شوکت تھی۔
وہ قبیلۂ خندق۔تمام قبائل میں اشرف تھا
تو اب ہم سب اسی روشنی اور نُور (کے سائے) میں ہیں۔اور
رشد و ہدایت و استقامت کی راہیں نکال رہے ہیں"

نعت میں صداقت ضروری ہے۔ جوشِ ایمان اور آشفتگی اور ایقان نعت کے بنیادی عناصر ہیں۔ نعت کے یہ اصول صحابہ کرامؓ نے واضح کیے ہیں۔ ملک شاہ سلجوقی نے بغداد میں عہدِ عباس میں (۴۸۵ھ) مجلسِ مولود منعقد کرائی اور نعت کے فن کو یہیں سے تقویت ملی۔ نعت گوئی جتنا باعثِ سعادت کام ہے اتنا ہی مشکل اور کٹھن بھی ہے۔ اس وصف یا ہنر میں ذرا سی بے احتیاطی، معمولی سی لغزش انسان کو آسمان کی رفعتوں سے پاتال کی گہرائیوں میں اچھال سکتی ہے۔ لفظوں کے یہ آبگینے اتنے نازک ہیں کہ زیر زبر کا فرق آنے سے نہ صرف ٹوٹ جاتے ہیں بلکہ بڑے بڑے اصحاب کو دین و دنیا سے بیگانہ کر دیتے ہیں۔ نعتِ رسول ﷺ کہنا ایک ایسی سعادت ہے جو کم لوگوں کے نصیب میں آتی ہے۔ لیکن اس سعادت کو سمیٹنے والوں میں مسلمان کیا غیر مسلم بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ شعرائے کرام نے جس جس زاویے سے اور جس جس انداز سے سیرتِ رسول ﷺ اور محاسنِ رسالت ﷺ کو پیش کیا ہے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔

نعت پر سب سے پہلے تحقیقی کام بھارت میں ہوا۔ رفیع الدین اشفاق کو نا گپور یونیورسٹی نے ان کے تحقیقی مقالہ "اردو میں نعتیہ شاعری" پر 1955ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ جو بعد میں پاکستان سے پہلی بار 1976ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے "

اردو کی نعتیہ شاعری'' کے عنوان سے کتاب لکھی جو 1974ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر ریاض مجید کو ''اردو میں نعت گوئی'' کے تحقیقی مقالہ پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی۔ پروفیسر عاصی کرنالی نے ''اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ تنقیدی روایت کے حوالے سے ادیب رائے پوری کی کتاب ''نعتیہ ادب میں تنقید اور مشکلاتِ تنقید''، ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی کی کتاب ''نعت اور تنقیدِ نعت''، ڈاکٹر کوکب نورانی کی ''نعت اور آدابِ نعت'' جاذب قریشی کی کتاب ''نعت کے جدید رنگ''، عزیز احسن کی ''نعت کی تخلیقی سچائیاں'' قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔

ماہنامہ ''نعت'' لاہور راجا رشید محمود کی زیرِ ادارت باقاعدگی سے چھپ رہا ہے۔ کراچی سے ایک اور کتابی سلسلہ ''نعت رنگ'' کے نام سے 1955ء سے شائع ہو رہا ہے جس کی 18 اشاعتیں اب تک ہو چکی ہیں۔ اس میں بھی اعلیٰ پائے کے تحقیقی و تنقیدی مضامین شاملِ اشاعت ہوتے ہیں۔ شاکر کنڈان نے 2003ء سے سہ ماہی کتابی سلسلہ ''عقیدت'' کے نام سے جاری کیا ہے جس میں تحقیقی و تنقیدی مضامین کو مناسب جگہ ملتی ہے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اب نعت کی تاریخ لکھتے وقت شاکر کی ''نعت گویانِ سرگودھا'' بھی درج بالا کتب کے ساتھ بطور حوالہ ضرور پیش کی جاتی رہے گی۔

شاکر کنڈان کی نعتِ رسول ﷺ سے محبت اور پیغمبرِ اسلام ﷺ سے گہری عقیدت کا ایک اور انمٹ، انمول اور اچھوتا نقش ''نعت گویانِ سرگودھا'' میرے سامنے ہے۔ سات سو اڑسٹھ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں تین سو ساون شعراء کا تذکرہ مع نمونۂ کلام دیا گیا ہے۔ اور سبھی شعراء کا تعلق سرزمینِ سرگودھا سے ہے۔ یہ تین سو ساون افراد بڑے خوش نصیب ہیں جنہیں نعت کے حوالے سے شاکر کنڈان نے تاریخ کے صفحات میں منتقل کر دیا ہے۔ ایک بات کھٹکتی ہے کہ شاکر نے ڈاکٹر وزیر آغا کی کوئی نعت شامل نہیں کی...... اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے اس کا بہتر اور مدلل جواب شاکر ہی دے سکتے ہیں۔ شاکر صاحب اگلی جلد میں اس کی وضاحت ضرور ہونی چاہیے......

شاکر کنڈان ایک انتھک، محنتی اور دیانتدار انسان کا نام ہے۔ دیانت دار انسان اس لئے کہ وہ جس کو جیسا سمجھتا ہے ویسا ہی اپنی کتابوں میں پینٹ کر دیتا ہے۔ اسے اس زمانے کی ہوا نہیں لگی جو منافقت اور جھوٹ کی بنیاد پر نام نہاد ترقی یافتہ عہد کی فضیلتوں سے فیض یاب ہونے کے لئے انسان کو قدم قدم پر بھٹکانے کا فرض نبھائے جا رہا ہے...... محنتی اس لحاظ سے کہ وہ پچاس سال کا نوجوان بوڑھا آج بھی ایک کھلنڈرا، من موجی اور ہر محفل کی جان ہے، لیکن جب لکھنے کی میز پر بیٹھتا ہے تو اس کا قلم رکنے کا نام نہیں لیتا۔ انتھک اس لحاظ سے کہ وہ ہر سال ایک نئی معرکۃ الآراء کتاب اپنے چاہنے والوں کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے...... ذرا دم نہیں لیتا اور دوسری کتاب پر کام شروع کر دیتا ہے۔

شاکر نے اپنے نام کے ساتھ ساتھ اپنی جنم بھومی ''کنڈان'' اور ''سرگودہا'' کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ اس کی علاقے سے اس خصوصی وابستگی اور محبت کا ثبوت ہمیں بہت سی جگہوں اور بہت سے مواقع پر ملتا ہے۔ جس سرزمین میں انسان کا بچپن، لڑکپن، نوجوانی، جوانی اور بڑھاپا وابستہ ہو وہی جنت نظیر ہوتی ہے لیکن شاکر کی خوش قسمتی کہ اس نے واقعی ایک جنت نظیر سرزمین پر جنم لیا اور سرگودہا کی اس لحاظ سے خوش بختی کی اُسے شاکر جیسا عاشقِ صادق میسر آیا جس نے اپنے علاقے اور سرزمین کے نعت نگاروں کا تذکرہ اتنی جانکاہی اور محنت سے مرتب کیا کہ تاریخ سرگودہا کا یہ خوبصورت، عقیدتوں اور محبتوں سے لبریز باب مکمل کیا کہ بہت سے گمنام مگر قدآور عاشقانِ رسول ﷺ سے اہلِ علم کو متعارف کرایا۔ اللہ تعالیٰ اسے توفیقِ ارزانی عطا فرمائے تاکہ وہ اُس علمی اور تحقیقی کارنامے کو سرانجام دے سکے کہ جس میں دُنیائے اسلام کے پہلے نعت نگار سے لے کر عہدِ حاضر کے تمام نعت نگاروں کا ذکر شامل ہے۔

......

۱۔ حنوق آپ ﷺ کی دادی کا لقب تھا۔

۲۔ (مطبوعہ سہ ماہی ''عقیدت'' (نمبر وتمبر) -۱۳۲ اپلی استقلال آباد سرگودہا، ستمبر ۲۰۰۸ء)

اردو ادب کا میجر جنرل.....شاکر کنڈان

سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ میں نے آج تک جس بھی قریبی دوست کی شخصیت پر یا اس کے کام کے بارے میں لکھا، بری طرح ناکام رہا ہوں۔ مجھے اپنے تناظر پر قابو نہیں رہتا اور ہمیشہ جانب داری کا عنصر غالب آجاتا ہے جس سے وہ معروضیت ختم ہو جاتی ہے جو اس قسم کی تحریروں کو ثقہ پن اور توازن دیتی ہے۔ بہرحال مجھے لکھنا بھی ہے اور کچھ نہ کچھ کہنا بھی ہے اور آج میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں یہ شاکر کنڈان کی شخصیت کا ہی سحر ہے کہ مجھ جیسا گوشہ نشین سرِعام کچھ کہنے کی جسارت کر رہا ہے۔ ورنہ میں تو اپنے احباب کے پرزور اصرار پر بھی استادِ محترم جناب نیاز سواتی مرحوم کا یہ قطعہ بطور نسخہ استعمال کرتا ہوں:

زندہ لوگوں پر نہیں تھیس لکھے جاتے حضور!
صبر اس کے واسطے کرنا پڑے گا آپ کو
چاہتے ہیں آپ پر تھیس اگر کوئی لکھے
پہلے اس کے واسطے مرنا پڑے گا آپ کو

بہرحال! میں تو اسی وقت ایک خوشگوار حیرت کی لپیٹ میں آ گیا تھا جب ٹیلیفون پر اس نے مجھ سے تعارف کے بعد درخواست کے لہجے میں حاضری یا ملاقات کے لئے وقت مانگا۔ ایک آفیسر اپنے سے پانچویں چھٹے درجے کے نچلے ملازم سے اتنی مدہم اور ملائم Tune میں بات کر رہا ہو تو اس ملازم کی حالت کا اندازہ غیر ملازم نہیں لگا سکتا۔ میری بھی حالت اس وقت یہی کچھ تھی۔ میں یہی سمجھا کہ یا تو اس افسر نے کوئی قانونی مشورہ لینا ہو گا یا پھر مجھ سے میرے دفتر سے متعلق کوئی ضروری انفارمیشن لینی ہو گی۔ میں جب اس کے دفتر میں داخل ہوا تو اٹھ کر میرے استقبال کو لپکا اور گفتگو کا سلسلہ چھڑا تو اس کی شخصیت کے کئی پہلو اور پرت کھلتے چلے گئے۔ تکبر، نخوت اور

غرور کے بجائے انکساری، متانت اور ایک قسم کی بردباری کا مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔ اور جب اس نے یہ انکشاف کیا کہ اس کی دو کتابیں ''اردو ادب اور عساکرِ پاکستان'' پہلے منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ تو میں فوراً پہچان گیا کہ یہ بندہ تو شاکر کنڈان ہے۔ کیونکہ میں اس کی دونوں کتابیں، اس سے پہلے ایک دوست کے پاس دیکھ چکا تھا۔ ٹیلیفون پر تعارف بھی کیپٹن عطا رسول کے حوالے سے ہوا اور چھاتی پر لگی نیم پلیٹ بھی یہی بتا رہی تھی۔

میں نہ تو پیشہ ور لکھاری ہوں اور نہ ہی زود گو شاعر۔ پارٹ ٹائم میں جتنی کچھ کمائی ہو سکتی ہے اتنی شاعری کرتا ہوں اور فارغ وقت میں جتنا کچھ مطالعہ اور لکھنے لکھانے کا کام ہو سکتا ہے وہ شغلاً کرتا ہوں۔ سال میں آٹھ دس مضامین اور پچاس ساٹھ اشعار میری average کمائی ہوگی۔ شاکر کنڈان نے اسی حوالے سے مجھ تک رسائی کا بہانہ تلاش کیا۔ انہوں نے بتایا کہ'' اردو ادب اور عساکرِ پاکستان'' کی تیسری جلد کا مواد تقریباً تقریباً اکٹھا ہو چکا ہے تاہم نظر ثانی کے لئے وقت نہیں مل رہا اور نہ کمپوزنگ کے لئے دے دیتا۔ میں نے از خود کمپوزنگ کی حامی بھر لی اور ساتھ ہی مشورہ دیا کہ میں کمپوزنگ شروع کرتا ہوں آپ مسودہ کی نظر ثانی کرتے جایئے۔ الغرض تیسرے چوتھے دن وہ تمام مواد میری جھولی میں جھونک کر فارغ ہو گئے۔ اور پھر ہماری ملاقاتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ تقریباً تین چار ماہ تک ان کی اکثر شامیں میرے غریب خانے پر گزریں جہاں مجھے ان کی شخصیت کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے ان کی کتاب کی اتنی تیزی سے کمپوزنگ کی کہ جو کتاب جنوری ۲۰۰۰ء میں چھپ جانا چاہیے تھی وہ جولائی تک کمپوز ہوتی رہی۔ لیکن شاکر کنڈان نے دبے لفظوں میں بھی حرفِ شکایت کو نوکِ زباں تک نہ آنے دیا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا بھی رہا کہ مجھے اس کی شخصیت کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

میں راولپنڈی میں جس شخص کا نام لیتا شاکر اس سے پہلے سے ہی متعارف ہوتا اور جس شخصیت سے میری ملاقات نہ تھی اسے میرے پاس لا کھڑا کرتا۔ میں خود حیران تھا کہ یہ شخص فوج کی سروس بھی کرتا ہے، بال بچوں والا بھی ہے، دوست احباب کا حلقہ اتنا وسیع ہے، مشاعرے

بھی پڑھتا ہے، مہمانِ خصوصی ہوتا ہے اور تحقیق کے میدان کا شہسوار بھی ہے۔ مطالعے کا شوقین ہی نہیں بلکہ رسیا ہے، تحقیق اسکا میدانِ خاص ہے کہ جس کے لئے شب بیداری اور رتجگے تو معمول کا کام ہوتے ہیں۔ یہ بندہ اتنے فرائض کس طرح ایک ساتھ ادا کر رہا ہے؟؟

اس سے پہلے، اردو ادب کے مؤرخین نے اردو زبان و ادب کا کئی حوالوں سے جائزہ لیا، کسی نے اس کی ترویج و ترقی کے حوالے سے، کسی نے علاقائی حوالے اور کسی نے اس کی نشر و اشاعت کے حوالے سے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر صرف ایک کوشش (ارباب سیف وقلم از بریگیڈیر اے آر صدیقی کے کہ جن کی کتاب بھی شاکر کنڈان کی اس سلسلے کی پہلی دونوں کتابوں کے بعد منظر عام پر آئی) کے علاوہ کسی نے بھی خالص عسکری لکھاریوں کا جائزہ اس انداز سے مرتب نہیں کیا۔ شاکر کے کام کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اردو ادب محض فوجی بھائیوں کے دم سے اس مقام تک پہنچا ہے۔ شاکر نے بہت سے لوگوں کا ذکر نہیں کیا ہوگا، بے شمار لکھاری اب بھی در پردہ ہوں گے، لیکن پہلی اینٹ ہی کسی عمارت کی بنیاد بن سکتی ہے اور اس نے تو اچھا بھلا پلازہ تعمیر کر کے لوگوں کے سامنے ایک شاہکار کی صورت لا کھڑا کیا ہے۔ اس کام کے لئے نجانے کتنی کٹھن اور دشوار گزار منزلوں سے گزرا ہوگا۔ کچھ مشکلات کا تو میں گواہ بھی ہوں۔

اس کام پر مجھے تنقید کا حق ایک لحاظ سے بالکل نہیں کیونکہ اس کام میں میری مداخلت محض کمپوزر کی حد تک محدود نہ تھی بلکہ بعض جگہ میں نے انہیں باہمی مشاورت بھی دی، لہٰذا میرا تنقید کا حق سلب ہو گیا۔ ویسے بھی میں ناقدین کے متعلق ڈرائیڈن (DRYDEN) کی یہ رائے پڑھ کر کچھ ڈر سا گیا ہوں، وہ کہتا ہے ''نقادوں میں نفرت کا جذبہ شدید ہوتا ہے جس بنا پر وہ اچھائیوں سے بھی چشم پوشی کر جاتے ہیں'' اور مجھے شاکر کنڈان کے معاملے میں کبھی بھی اس قسم کے ناگوار احساسات سے واسطہ نہیں پڑا، بلکہ ہر ملاقات پر اس کے لئے محبت کے جذبے میں کچھ اور اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح ایمرسن (EMERSON) کہتا ہے کہ ''جسے شعر گوئی میں ناکامی ہوتی ہے وہ جھنجھلا کر تنقید نگاری کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے''۔ اور میں اپنے آپ کو ناکام شاعروں میں

شامل بھی نہیں کرنا چاہتا۔ لہٰذا میں ''اردو ادب اور عساکرِ پاکستان (جلد اول حصہ دوم)'' کے بارے میں کم سے کم بات کروں گا۔ تاہم شاکر کنڈان کے بارے میں میں جتنا کچھ جانتا ہوں اس کا اظہار کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ ابنِ خلدون نے ایک جگہ لکھا تھا کہ ''تاریخ مرتب کرنا گویا اپنے خونِ جگر سے کسی شاہکار کو کشید کرنے کے مترادف ہے''۔ اور شاکر کنڈان نے نام نہاد سکہ بند مؤرخین پہ ثابت کر دیا کہ فوجی کو خشک دماغ، حکم کا غلام اور عرف عام میں ''بُٹ دماغ'' کہنے والو! تمہاری زبان پہ جتنا احسان ان فوجیوں کا ہے کیا تم کوئی دوسری مثال پیش کر سکتے ہو؟ کسی ایک شعبہ حیات سے منسلک اتنے لوگوں کا کام سامنے لاؤ؟؟ اور وہ ایک سوال کی صورت ان نام نہاد مؤرخین کے سامنے چھاتی تانے کھڑا انھیں پکار پکار کر کہہ رہا ہے

کیا ضروری ہے مصلے پہ فقط زاہد ہو
رونے والا کوئی میخوار بھی ہو سکتا ہے

شاکر کنڈان نے وہ کام کر دکھایا ہے کہ جس کے لئے قومی اداروں کو گرانٹیں ملتی ہیں اور بجٹ میں سے ایک خطیر رقم محض ادب کے نام پر کانفرنسیں اور سیمپوزیم منعقد کرانے پر خرچ کر دی جاتی ہیں، لیکن اس بندے کا حوصلہ دیکھئے کہ اس نے اپنی قلیل تنخواہ میں سے جو کچھ پس انداز کیا، اپنے اس عشق کی نذر کر دیا۔ اس کی اس جسارت پر بقول اس کے کئی ایک سکہ بند قسم کے موسمی تجزیہ نگاروں نے انگلیاں بھی اٹھائیں کہ صاحب یہ نامکمل تذکرہ یا کام ہے اس میں فلاں فلاں صاحب شامل ہی نہیں۔ اس نے جواباً بس اتنا کہا:

تم یونہی ناراض ہوئے ہو ورنہ میخانے کا پتہ
ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

ورنہ وہ کہاں کہاں نہیں گیا، اس نے کس کس کے در پر دستک نہیں دی، لیکن لکھنے والے اگر چھپتے پھریں تو اس پہ الہام تو ہوتا نہیں کہ فلاں فلاں لکھاری اس شہر میں چھپا بیٹھا ہے۔ پھر بھی اس نے وہ وہ لوگ فوجی یونیفارم میں لا کھڑے کئے ہیں جن کا فوج کو بھی پتہ نہ تھا۔ یہ اس

کی ریاضت اور محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

''اردو ادب اور عساکرِ پاکستان'' کی جلد اول، حصہ دوم کی اشاعت کے بعد مکمل ہو گئی ہے لیکن شاکر کنڈان کی زنبیل میں ابھی تک بہت سے کرشاتی تجربے منہ چھپائے رونمائی کے منتظر ہیں۔ جلد دوم کا حصہ دوم ابھی زیر ترتیب ہے اس کے لئے نجانے کس کس در پر دستک جاری ہے۔ شاکر کنڈان کے سامنے اگر آپ کہہ دیں کہ استاد امام دین گجراتی بھی ایک جنرل تھا تو وہ سچ مان لے گا تا وقتیکہ وہ اپنی تحقیق سے یہ ثابت نہ کر لے کہ یہ جھوٹ یا دل لگی تھی۔ یہ اس کا بھولپن نہیں بلکہ اس کی متجسس طبیعت کا خاصا ہے۔ وہ بات کی تہ تک جا کر اسے سمجھنے کی خداداد صلاحیت سے مالا مال ہے۔ شاکر کنڈان کی موٹر سائیکل میں پیٹرول پانی کی طرح استعمال ہوتا ہے اور حق حلال کی کمائی کا پیسہ تو وہ پاکستانی معاشرے میں پھیلی پلوشن کی طرح بس اڑاتا جا رہا ہے۔ وہ ہر اس شک کی گردن پر سوار ہوتا ہے جس سے حقیقت کے انکشاف کی توقع ہو سکتی ہے۔ اس کے پاس کام بہت زیادہ ہے اور وہ بھاگتے وقت کو گریبان سے نہ صرف پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ اسے گرفتار کرنے جرات بھی رکھتا ہے۔ اور وہ اپنے کام سے یہ بات کسی حد تک ثابت بھی کر چکا ہے کہ:

شرط اتنی ہے گریبان سے پکڑے کوئی
بھاگتا وقت گرفتار بھی ہو سکتا ہے

اس دور میں انسان کے پاس وقت اتنا کم ہو گیا ہے اور اس کی مصروفیات اتنی زیادہ ہو گئی ہیں کہ اس کے لئے اب درجن بھر کتابیں پڑھنا مشکل ہو گیا ہے چہ جائیکہ ایک درجن ضخیم کتابیں تصنیف یا تالیف کرنا۔ اور شاکر کنڈان نے یہ معرکہ بھی بخیر وخوبی سر کر لیا ہے۔ سفرنامہ اس نے لکھا، نعت لکھی، غزل، نظم، اردو نعت کے حوالے سے پاکستانی افواج کا کام، سرگودھا کے نعت گو شعرا، راولپنڈی کے نعت گو شعراء اور کراچی کے نعت گو شعراء کے علاوہ ان کا اپنا شعری مجموعہ، ترجمہ، افسانہ اور تحقیق کیا کچھ نہیں کیا۔ اس ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخص کو چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا

کہنے کو جی چاہتا ہے۔اس کی شخصیت کے اتنے پرت ہیں کہ برملا یہ کہنے کو جی چاہتا ہے:

دیکھتا ہوں تو کبھی چاند کبھی پھول ہے وہ
اپنی صورت مجھے از بر نہیں ہونے دیتا

شاکر کنڈان ایک با اصول، محنتی، مخلص اور مستعد انسان ہے جو اپنے کام اور پیشے سے ازلی محبت کرتا ہے۔ وہ اُس پتھر کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہے جسے نام نہاد پہلوان بھاری جان کر کنی کترا کے نکل جاتے ہیں۔ شاکر کنڈان سے ہم جیسے دوستوں نے بارہا کہا بھی ہے کہ جناب دوسروں پر بہت کام ہو چکا۔اب ذرا اپنا کام (نثری اور شعری) مرتب کریں، مگر وہ ہنس کے ٹال جاتا ہے۔ وہ ان لوگوں کے لئے کام کر رہا ہے جنہیں نام نہاد میڈیا اور ادبی گروپ اپنی حدود میں جھانکنے کی اجازت تک نہیں دیتے۔ وہ ایسے لوگوں کو متعارف کرانے کی کوشش کر رہا ہے جنہیں اس بات کا احساس ہی نہیں کہ وہ بھی اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

شاکر کنڈان کسی بھی ایوارڈ یا شملے کا محتاج نہیں، اس میں نہ حرص ہے اور نہ ہوس کا اس کے ہاں گزر ہے۔ وہ یہ کام کسی لالچ کے بغیر بے لوث خدمت کے طور پر کر رہا ہے۔ اس کی یہ ریاضت اور لگن ہمیں ایک اور ہی پیغام دے رہی ہے۔ بقول شاعر:

ہم کو نہ ہے قبا کی نہ دستار کی طلب
اپنا فقیہ شہر سے جھگڑا ہی اور ہے

جوش ملیح آبادی نے ایک محفل میں کہا تھا کہ ''فن تو اپنے آپ کو منواتا ہے اور فنکار کبھی بھی اپنے شاہکار کو حرص کا لبادہ اوڑھ کر تخلیق نہیں کرتا''۔ یہی بات شاکر کنڈان کے بارے میں صادق آتی ہے۔ پھر بھی میں کہوں گا کہ شاکر کنڈان نے تنِ تنہا جو یہ کام کر دکھایا ہے، اس کی محنت، جرات اور اعلیٰ معیار پر، کسی نہ کسی ادبی ایوارڈ کے لئے ضرور نامزد ہونا چاہیے۔ اگر کیپٹن عطا رسول فوج میں جرنیل نہیں بن سکا تو اس کی اپنی قسمت، لیکن شاکر کنڈان کو اس کام پر اردو ادب میں کم از کم میجر جنرل کا عہدہ ضرور ملنا چاہیے۔

شاکر کنڈان اور وجدان کی دوسری آنکھ

انسان کے باطن میں ایک ایسی قوت پوشیدہ ہے جسے عقل کا ہم پلہ یا ظلِ ناقص کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ عمل میں عقل کی نسبت کم مفید ہونے کے باعث اسے مرکز سے باہر دھکیل دیا گیا ہے۔ لیکن وہ قوت عقل کے مقابلے میں زیادہ دیرپا اور قابلِ عمل فوائد کی حامل ہے جو بہت سے مخفی پہلوؤں کو زیادہ امتیاز و نمود کے ساتھ باہر لانے کی پیش خیمہ بنتی ہے۔ اس قوت کا نام ''وجدان یا جبلت'' ہے۔ عقل اور وجدان کے مابین نظر اور لمس کا رشتہ ہے۔ عقل دور کی اشیاء کا ادراک نہیں رکھتی لیکن وجدان اپنی خداداد قوت سے اشیاء کے باطن تک رسائی پاتا ہے اور کسی بھی عمل کے دور رس نتائج کا صحیح ادارک رکھتا ہے۔ وجدان کی بنیادی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ دُنیا کو الگ الگ اشیاء میں تقسیم نہیں کرتا جبکہ عقل ایسا کرتی ہے۔ وجدان کی رہنمائی میں ہم حقیقتِ اشیاء تک رسائی کی جستجو کر سکتے ہے۔

آج دنیا بھر میں زیرِ زمین سرنگیں کھود کر ریلیں چلانا، میلوں تک زمین اور پہاڑ کھود کر زیرِ زمین تیل نکالنا، بڑے شہروں کی سڑکوں کو کھود کر ٹیلیفون کے کیبل، پانی کے نل اور گیس پائپ لائنیں بچھائی جا رہی ہیں۔ سائنس جتنی ترقی کر رہی ہے زمین ہی کا سینہ چاک ہو رہا ہے۔ مادی وسائل پر قبضہ کرنے کے لئے ہی مادی ذرات کا سینہ چیر کر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنائے جا رہے ہیں۔ خاک کو اس طرح چاک کرنے سے کوئی روحانی یا اخلاقی ترقی نہیں ہو رہی البتہ ذرائع معاش بڑھ رہے ہیں۔ اس مادی ترقی کے متلاشی انسانوں کو مولانا رومیؒ نے چوہے سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن جب انسان اس سے بلندتر حکمت کا طالب ہوتا ہے تو عقلِ موسوی یعنی وجدان کی حقیقی سچائی تک پہنچ جاتا ہے۔ ایسی ذہنی و روحانی ترقی کو وجدانِ حیات کہا گیا ہے۔

حیاتِ انسانی دو طرح سے حقیقتِ اشیاء کے ادراک کے مواقع فراہم کرتی ہے۔

پہلی چیز کسی واقعہ یا چیز کا عملی مشاہدہ ہے اور دوسرا کسی بھی عمل کا ذاتی تجربہ ہے یا یوں کہیں کہ زندگی مشاہدے اور تجربے کا نام ہیں ۔لیکن تجزیہ عقل اور معروضی حالات کو مدِ نظر رکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔عملی تجزیہ کرتے وقت عقل جہاں جواب دے جاتی ہے وہاں وجدان کی قوت ہاتھ تھام کر راہنمائی کا فریضہ سنبھال لیتا ہے اور کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے اس کے نتائج وعواقب کی تصویر نمایاں کرتا جاتا ہے۔شاکر عمل پہ یقین رکھتا ہے اور زندگی کا عملی پہلو ہمیشہ اس کے مدِ نظر رہا ہے۔وہ چھوٹے چھوٹے واقعات، احساسات، تاثرات اور معمولی حادثات کے باطن میں جھانک کر کسی حساس کیمرے کی طرح زندگی کا ہر پہلو سے نہ صرف مطالعہ کرتا ہے بلکہ اس مطالعے، مشاہدے، تجربے اور تجزیے میں دوسروں کو بھی شریک کرتا ہے ۔شاکر علم پہ کم اور عمل پہ زیادہ زور دیتا ہے اور یہی خصوصیت اس کی تحریر کو جاذب، موثر اور قابلِ عمل بناتی ہے۔

انسان کے افکار اس کی زندگی کے انداز کو متعین کرتے ہیں۔ روح و بدن کی تندرستی اور صحت کا دارومدار بھی انسانی افکار پر ہے۔غم آگیں تفکر سے انسان موم کی طرح گھلتا جاتا ہے اور اچھے خیالات سے روح و بدن دونوں تر و تازہ رہتے ہیں ۔شاکر نے معمولی واقعات، حادثات، احساسات اور مشاہدات سے زندگی کے مثبت اور روشن پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی نہ صرف کوشش کی ہے بلکہ اس میں یقینی طور پر کامیاب بھی ہوا ہے ۔شاکر نے اگر کسی ناگوار واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے تو اس سے زندگی کا مثبت اور روشن پہلو ہی قاری کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ بے جا تنقید سے گریز کیا ہے اور لایعنی بحث ومباحثہ میں الجھنے کی کوشش بھی نہیں ...... کسی فلسفی کا کہنا ہے ''چشمِ عارف ہنر بین ہوتی ہے اور چشمِ حاسد عیب چین'' ......یعنی عارف ہنر دیکھتا ہے اور حاسد عیبوں پر نظر رکھتا ہے لہٰذا دوسروں کی خوبی پر نظر رکھو تو اس کا نتیجہ تمہارے لئے بھی اچھا ہوگا اور دوسرے کے لئے بھی ......بقول میر دردؔ:

آتے ہیں میری نظر میں سب خوب

جو عیب ہے پردۂ ہنر ہے

''وجدان کی دوسری آنکھ'' میں شامل نثر پاروں کو پڑھ کر نہ بوریت کا احساس ہوتا ہے اور نہ بوجھل پن محسوس ہوتا ہے بلکہ قلب ونظر میں کشادگی کی پھلجھڑیاں پھوٹتی محسوس ہوتی ہیں ۔ان نثر پاروں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک لازوال فن پارے کا خاصہ ہوتی ہیں ۔ان نثر پاروں کو پڑھتے وقت انسان زندگی کے تاریک پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کی ہماہمی اور رنگا رنگی کو بھی محسوس کرتا ہے۔سوچ وفکر کے دھارے زندگی کے مثبت پہلوؤں کی سمت متعین کرتے ہیں اور تاریکیاں چھٹنے لگتی ہیں ۔اگر شاکر کو چند مخلص دوستوں نے یہ نثر پارے شائع کرنے کی تحریک دی ہے تو وہ اس کام کی افادیت اور اہمیت سے یقیناً آگاہ ہوں گے ۔اللہ شاکر کو ایسے مخلص دوستوں کی صحبت تا دیر میسر رکھے (آمین) ۔

علم وحکمت کے لازوال موتی

ملک شاہ سوار علی ناصر کی کتاب ''چھج پتاسے'' پر تاثرات

ملک شاہ سوار علی ناصر اب تک اہل ادب کو اردو اور پنجابی نظم ونثر کی چار کتابیں زخمی چیخیں (اردو کہانیاں)، کرلاٹ (پنجابی کہانیاں)، بکاٹ (شعری مجموعہ)، کچھ بھی نہ کہا (انٹرویو شاکر کنڈان) کے نام سے دے چکے ہیں۔ شاعری، افسانہ نویسی، خاکہ نگاری، تحقیق اور نجانے ادب کی کتنی جہتیں ہیں جن کے دران کے قلم وفکر کی طرف کھلتے ہیں۔ خواجہ میر درد کا شعر ہے:

آتے ہیں میری نظر میں سب خوب

جو عیب ہے پردۂ ہنر ہے

خواجہ میر درد نے ''پردۂ ہنر'' کو عیب کہا ہے لیکن اسی پردۂ ہنر میں ایک اہم بات پوشیدہ ہے جسے میں مشاہدے کی حس سے تعبیر کرتا ہوں۔ حساس دل اور دماغ کے ساتھ ساتھ اگر اللہ رب العزت کسی انسان کو حساس نظر بھی عطا کر دے تو بصارت سے بصیرت کا سفر بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ملک شاہ سوار علی ناصر پر بھی اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ انہیں قادر مطلق نے بصیرت کی دولت سے مالا مال کیا ہے اور اس بات پر شاہد ان کی تازہ تصنیف ''چھج پتاسے'' ہے۔ چھوٹی سی ضخامت کی یہ ایک بہت بڑی کتاب ہے جس میں انہوں نے گویا علم وحکمت کے لازوال گوہر گرانمایہ جمع کر دیے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں، چھوٹے چھوٹے واقعات اور معمولی حادثوں کے بطن سے حکمت وبصیرت کے انمول موتی کشید کر کے انہوں نے جمع کر دیے ہیں۔

کہتے ہیں انسان اپنی مجلس سے پہچانا جاتا ہے اور ملک شاہ سوار علی ناصر کا یارانہ ہی ایک ایسی شخصیت سے ہے جو علم وحکمت کا گویا ایک سمندر ہے۔ کتاب کا انتساب پڑھتے ہی اس علمی شخصیت کا تعارف بھی ہو جاتا ہے اور صاحبِ کتاب کا سلسلۂ علم وحکمت پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں

پڑتی ۔عربی زبان وادب کی تاریخ میں بالخصوص اور عالمی ادب میں بالعموم خلیل جبران کا جو منصب ہے اس سے اہلِ علم اچھی طرح واقف ہیں ۔اسی کی پیروی میں شاکر کنڈان نے وجدان کی پہلی آنکھ اور پھر وجدان کی دوسری آنکھ کے نام سے اردو زبان میں نثر پارے پیش کئے تو جس طرح شاکر کنڈان خلیل جبران سے متاثر نظر آئے اسی طرح ملک شاہ سوار علی ناصر بھی شاکر کنڈان سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکے ۔شاکر کنڈان اور ملک شاہ سوار کی کتابوں کی زبان، مٹھاس، رس اور ذائقہ جدا جدا سہی لیکن ان میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے حلقۂ ادب (اردو اور پنجابی) میں معمولی واقعات ومشاہدات سے قارئین کو بہت زیادہ سوچنے اور سمجھنے کی تحریک دی ہے۔ ملک صاحب چونکہ پنجابی زبان وادب کے شاہ سوار ہیں اس لئے انہوں نے اس زبان کے بنیادی قواعد وضوابط سے کسی بھی جگہ انحراف نہیں کیا اور اپنی بات کہنے کے دوران کہیں بھی لہجے، روایت اور تہذیب وثقافت کی ضروریات کو نظر انداز نہیں کیا۔ جو بات جس انداز میں کہنا لازم تھا اسے اسی انداز میں انتہائی سادگی اور پرکاری سے کہہ گئے ۔دراصل یہی سادگی اور پرکاری ہی اس کتاب کی جان ہے۔

انہوں نے بے شمار مقامات پر نہ صرف اقوال وواقعات کو نقل کیا بلکہ اپنی بات کو مزید مؤثر بنانے کے لئے غور وفکر کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ مثلاً

الف ۔ ''بازاراں وچ کڑیاں لئی رنگ برنگ تے سوہنے دوپٹے ویکھن
نوں تاں بتھیرے نظریں پیندے نیں، پر کُڑیاں دے سر ہولی ہولی ننگے
ہونے جار ہے نیں ...... ایہہ گل سوچن دی؟''
(ترجمہ: بازاروں میں لڑکیوں کے لئے رنگ برنگے اور خوبصورت
بے شمار دوپٹے نظر آتے ہیں لیکن ان کے سر آہستہ آہستہ ننگے ہوتے جا
رہے ہیں ......غور کرنے والی بات ہے نا؟)۔

ب ۔ ''ساڈے ملک دے اک وزیر اعلان کر دتا ہے میں سرکاری خزانے

چوں تنخواہ نہیں لینی۔ پر اوہدے علاج معالجے تے ترن کروڑ توں
ودھ خرچا ہویا......گل ہساں اوپری؟''

(ترجمہ: ہمارے ملک کے ایک وزیر نے اعلان کر دیا کہ میں سرکاری
خزانے سے تنخواہ نہیں لوں گا لیکن اس کے علاج معالجہ پر تین کروڑ
سے زیادہ اخراجات ہوئے......عجیب بات ہےنا؟)

ج۔ ''ہر ویلے لوکاں نال ملدے رہندے او، پر کدیں اپنے آپ نال
وی ملےاو......گوہ کریو!''

(ترجمہ: ہمیشہ لوگوں سے ملتے رہتے ہو لیکن کبھی اپنے آپ سے بھی
ملے ہو......غور کرنا!)

سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں''جس زمانے میں لوگوں کو خالص اور وافر خوراک میسر تھی مغربی حکماء نے شادی کی بھر پور مرادمندی کے لئے عمر کے پیمانے مقرر کر رکھے تھے کہ مرد ۲۴ برس کا ہو اور عورت بیس برس کی لیکن لکھنے لکھانے کے لئے عمر کا کوئی پیمانہ مقرر کیا جا سکتا''۔لیکن ملک شاہسوار علی ناصر بالغ ہو کر ابلاغ کی طرف آیا ہے۔وہ ایک ایسا وسیع المطالعہ، بالغ نظر لکھاری ہے جو لکھنے کے آلات ہی نہیں رکھتا بلکہ لکھنے کے لائق معلومات بھی رکھتا ہے۔علم، اعتماد، بے خوفی اور منصفی اس کی تحریر کے بنیادی اجزا ہیں۔وہ تنقید و تجزیے کا حق آگہی، دلیری اور منصفی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔اس کے لفظوں کے پیچھے تاریخ، مطالعہ، مشاہدہ اور علم انگڑائیاں لیتا ہے لیکن اس کی دانشوری محض سخنوری پر غالب نہیں آتی۔تحریر کو بوجھل نہیں ہونے دیتا اور گرجتا کم ہے برستا زیادہ ہے۔جس کا ایک اہم ثبوت اس کی تازہ پنجابی کتاب ''پچھ پتا ہے'' ہے۔پنجابی نثر انوں کی یہ کتاب اپنے دامن میں علم و حکمت کے لازوال موتی سمیٹے ہوئے ہے۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ (آمین)۔

......پھر کہانی از خود بولتی ہے

(ملک شاہ سوار علی ناصر کی پنجابی کہانیوں کے مجموعے "تے وت"...... پر ایک تاثراتی تحریر)

بدھ بھکشوؤں کی ایک مشہور حکایت ہے

''ایک بھکشو نے اپنے گرو سے دریافت کیا، بدھ کون ہے؟ گرو نے اپنی زبان نکال کر اسے دکھا دی......بھکشو ادب سے جھک گیا ......گرو نے کہا ایسا نہ کرو، تم جھک کیوں گئے؟ بھکشو نے کہا میں اس مہربانی پر احسان مند ہوں رہوں گا۔ تم نے اپنی زبان پر مجھے بدھ کے درشن کرا دیئے......گرو نے جواب دیا میری زبان پر ایک زخم ہے''۔

زبان کے اسی زخم کا رشتہ انسان کے تصور اور قصہ گوئی سے بہت پرانا ہے۔ یہی زبان کا زخم ہے جس نے تخلیقی فن کار کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ زندگی کے تجربات کا نچوڑ، قصوں، حکایتوں اور کہانیوں کی صورت میں سناتا رہا ہے اور آج بھی سنا رہا ہے۔ نئی اور پرانی کہانیاں ...... جو اپنے عہد کی بصیرت کا جادو جگا کر نئی حسیت پیدا کرتی ہیں۔ ملک شاہ سوار علی ناصر بھی اسی زبان کے زخم کا مارا ہوا ہے۔ وہ قصہ گو تو نہیں ہے لیکن قصہ گوئی پر اس کی بصیرت کی بنیاد ہے۔ وہ ذہنی طور پر داستانوں کے زمان و مکان کا مسافر ہے اور جب اپنے سفر سے پلٹتا ہے تو اپنی دنیا کے تلخ و شیریں تجربات کو انہیں کہانیوں کے سہارے بیان کر دیتا ہے اور پرانے حوالوں سے اپنے دور کے نئے مسائل کو عصری تقاضوں کے مطابق بیان کر دیتا ہے۔ اسے داستان کو حقیقت بنانے کا فن اور منطق آتی ہے۔ اس کے فن کا نمایاں وصف اور ہنر یہی ہے کہ اس کی ہر کہانی میں داستان کا عنصر ضرور ہوتا ہے لیکن وہ داستان کو کہانی بنا دیتا ہے اور اس طرح کہ دونوں میں تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

کہانی کیا ہے اور کیا چیز کہانی کو کہانی بناتی ہے......اچھی کہانی میں کیا ہو......اس کا حتمی

اور تسلی بخش جواب شائد ممکن نہ ہو...... آخری فیصلہ ذوق اور وجدان ہی کا ہوتا ہے۔ یہاں سے تاثیر وتاثر کی بات شروع ہوتی ہے۔ اچھی کہانی متاثر کرتی ہے اور انسان اس کی گرفت میں آجاتا ہے۔ اس کی تاثیر لمحاتی بھی ہوتی ہے اور دیر پا بھی...... یہ ایک عہد سے متعلق ہونے کے باوجود اپنے زمانے کی سرحدوں کو عبور کر جاتی ہے۔ ایک طرح یہ لا زماں سے لا مکاں ہوتی ہے۔ ہر عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اپنے عہد، اپنے عصری تقاضوں اور اپنی سرزمین سے گہرا رشتہ ہونے کے باوجود اس کی حسیت اپنی سرزمین کی خوشبو اور اپنی تہذیب کی روح کو ہمیشہ زندہ رکھتی ہے۔ ایک زبان کی ادبی اقدار کو اتنی وسعت عطا کرتی ہے کہ وہ ہر دور کے شخصی اور اجتماعی میلانات کے کا ساتھ دینے کے قابل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک آزاد ذہنی ماحول میں پرورش پاتی ہے۔ دل کی زبان بن جاتی ہے۔ آپ بیتی میں جگ بیتی کا رنگ بھر دیتی ہے۔ ترجمہ سے بالاتر اور ترجمانی سے قریب بلکہ آپ اپنی ترجمان ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ہر شخص کو اپنے تجربے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

تجربہ جب تک سچا اور گہرا نہ ہو اسے زبان میسر نہیں آتی۔ فن ہی کے ذریعے جذبے اور احساس کا ابلاغ ممکن ہوتا ہے۔ اگر فنکار کو احساسات کے لئے الفاظ مل جائیں تو حرف کی تاثیر، جذبے اور احساس کو سننے یا پڑھنے والے پر طاری کر دیتی ہے۔ رہی یہ بات کہ اپنے دور کی حسیت سے فنکار کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ وہ خارجی حقیقتوں کو داخلی طور پر محسوس بھی کرتا ہے۔ ماحول کے حسن و جمال یا اُس میں پھیلے ہوئے دکھوں کو کس طرح اپنی ذات کا حصہ بنا لیتا ہے اور انہیں کس طرح عمومیت کا رنگ دیتا ہے؟ مشاہدات اور تجربات کو کیسے زندگی کی حرارت دے کر زندہ کر دیتا ہے؟ اس کا اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے کوئی حتمی فیصلہ نہیں سنایا جا سکتا۔ انسان کے تخلیقی تجربے سے گزرنے کے بعد مشاہدات، تخیلات اور احساسات کو زندہ کر دیتے ہیں اور لفظ ان کا قائم مقام بن جاتا ہے جب لفظ، مشاہدے، تخیل اور احساس کا فرق مٹ جاتا ہے تو تخلیق کو زبان ملتی ہے یہیں سے تاثیر کا سرچشمہ پھوٹتا ہے۔

اگر جذبات اور احساسات دریا کی طرح امڈ امڈ کر سیلاب کی سی شدت کے ساتھ بہنے اور پھیلنے لگیں یا گھنگھور گھٹا کی طرح گھر گھر کا برسنے لگیں تو فن کی تاثیر شدید مگر لمحاتی ہوتی ہے اور اگر جذبات میں گہرائی اور احساس میں صداقت ہو، جوش اور شدت نہ ہو، طوفان تہہ نشین ہو اور سطح دریا پر ہیجان نہ ہو، تو اثر دیر پا ہوتا ہے۔ اعلیٰ اور پرانی شراب کے نشہ کی طرح۔ خوشگوار ہوا کا ایک جھونکا ہو یا نسیم سحری کا ٹھہراؤ، سرور دونوں میں ہوتا ہے۔ زخم اور ناسور...... دُکھن دونوں میں ہوتی ہے لیکن تاثیر کی سطح مختلف ہو جاتی ہے۔ تخلیقی نثر کا اثر دریا کی طرح ہوتا ہے جو طوفان میں بھی اپنے کناروں کے اندر بہتا ہے اور جمے ہوئے بادل کی طرح مسلسل برستا ہے۔ ملک شاہ سوار علی ناصر کی نثر حدود سے متجاوز نہ ہونے کے باوجود متاثر کرتی ہے اور گہرے نقش چھوڑ جاتی ہے۔ اگر آپ اس سے ملے ہوں گے تو آپ کو اس کی پرسکون خاموش اور دلآویز مسکراہٹ نے ضرور بتا دیا ہوگا کہ اس کے دو معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ اس کی یہی مسکراہٹ اور سنجیدگی اس کی تحریروں میں سرایت کر گئی ہے اور یہی اس کی شخصیت کی سطح متعین کرتی ہے۔ اسی مسکراہٹ سے اس کے دُکھ سکھ کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ اس کے دل کے ہیجان کو ظاہر کرتی ہے اور چھپاتی بھی ہے۔ یہ اس کی پہچان ہے کچھ یہی کیفیت اس کی کہانی کی ہے۔ اس کی مسکراہٹ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ دھیما اور کم سخن ہے۔ اس کے فکر و فن میں بھی اس کی مسکراہٹ کی سی سچائی ہے۔ اس کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ نے اکثر باتیں زیر لب کہی ہیں اس کی آواز ایک سطح سے زیادہ بلند نہیں ہوتی۔ خطابت کا رنگ اس کے ہاں نہیں ہے جو داستانوں میں اپنا جواز تلاش کر لیتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اس نے محض داستانیں بیان نہیں کی ہیں بلکہ ان کی روح کشید کی ہے اور یہ روح اپنے داستانی کرداروں میں بڑی احتیاط سے پھونکی ہے تاکہ وہ اس کے قابو سے باہر نہ ہونے پائیں...... اس کی شائستگی کا تقاضا بھی یہی تھا۔

کہانی کہنا بہر حال ایک فن بھی ہے اور فن سے تہذیب و شائستگی کا گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا لہجہ شائستگی کا لہجہ ہے۔ یہ نہیں کہ اس کی کہانیوں میں تلخ و ترش نہیں ہے لیکن شائستگی نے اس کی نشتریت میں کاٹ تو پیدا کی ہے مگر یہ کاٹ بے رحمانہ نہیں ہے۔ اس کی کاٹ کے زخم

مندمل ہو تے ہیں تو دل میں کسک سی باقی رہتی ہے لیکن جلد پر زخم کا نشان نہیں چھوڑ تی ۔ وہ ایک جدید حسیت کا سچا فنکار ہے لیکن اس کے فن میں بلا کا سلیقہ اور رکھ رکھاؤ ہے ۔ وہ روایت کا احترام کر تے ہوئے بھی گفتنی نا گفتنی دونوں باتیں کہہ جاتا ہے ۔ وہ روایت کا احترام کرتا ہے اس کا اسیر نہیں ہے ۔ اس کے ہاں ایک انحراف کی کیفیت ہے بغاوت نہیں ۔ وہ نا گوار کو گوارا بنانے کا قرینہ جانتا ہے ۔

ملک شاہ سوار علی ناصر نے اپنی علامتیں اپنے استعارے، اپنے کنائے، تلازمے اور تلمیحات روایتی داستانوں اور قصوں سے لئے ہیں اس طرح ان قصوں کی باز آفرینی ہی نہیں کی بلکہ ان کو نئے معنی بھی دیئے ہیں ۔ اس کے موضوعات تلخ تجربات پر مبنی ہو سکتے ہیں لیکن وہ تلخ کلام نہیں ہے ۔ تلخیوں کی نا گوار کیفیات کو اس نے روایتی داستانوی رنگ آمیزی سے کم کر دیا ہے لیکن ان کے سہارے ان کی شدت کو بھی پورے طور سے ظاہر کر دیا ہے ۔ اس کی کہانیوں کا ایک بہت بڑا حصہ اسی قسم کی معنویت کا حامل ہے ۔ داستانوں سے وہ ان کے خالقوں کی طرح سلانے کا نہیں بلکہ عہد حاضر کے فنکار کی طرح جگانے کا کام لیتا ہے ۔ وہ قصہ گوئی کے تلازموں کا سہارا لے کر اپنے فن کی اس جہت کی وضاحت بھی کرتا ہے کہ وہ پہلے تخیل کی پریوں کا سہارا ڈھونڈ کر خضر کی راہ دیکھتا رہا کہ اس سے اسم اعظم معلوم ہو سکے پھر فسانوں کی پناہوں سے نکل کر حقائق کے بیکراں وشت میں سفر کرتا رہا تب جا کر کہیں اسے اس ہنر پر دسترس حاصل ہوئی ہے کہ وہ داستانوں کو حقیقت بنا کر پیش کر سکے لیکن اس راہ میں کئی سخت مقام آتے ہیں ۔ ان اندھیری راہوں پر راہی کو جاں بکف آبلہ پا ہو تے ہوئے بھی مشعل دانش لے کر چلنا ہوتا ہے لیکن راستہ خطرات سے خالی نہیں ہے ۔ کسی موڑ پر ہیروشیما بھی مل جاتا ہے جو اسے منزل کی سمت سے بھٹکا کر کچھ عرصے کے لئے دھندلکوں میں بھٹکتا چھوڑ دیتا ہے ۔ اس راہ کی تاریکی اور سکوت بڑا جان لیوا ہوتا ہے جس کی وجہ مصلحت آمیزی بھی ہو سکتی ہے جس کی تہہ میں ذاتی مفاد پرستی ہے اس فضا میں سانس لینا وہی جانتے ہیں جنہیں زندگی کرنے کا فن آتا ہو ۔ اس گھٹا ٹوپ اور ہمت پست کر دینے والے

اندھیرے میں خود کو دلاسا بھی دیتا ہے۔ ایسی صورت حال میں خود کو مملکتِ تخیل کا گمنام مجھنے لگتا ہے اور اپنے آپ سے دریافت کرتا ہے کہ خوابوں کی سبز پری اس سے اس طرح گریز کیوں کرنے لگی ہے۔ اس کی یہ گمشدگی کسی مہتاب کے سائے کے اثر سے تو نہیں ہے جب کسی طوفان کے آثار نظر نہیں آتے تو اس کے خیالات کی موجوں میں یہ تلاطم کیسا ہے؟ ذرا ہوش آتا ہے تو وہ خواب دیکھنے لگتا ہے لیکن اس کے خواب اپنی سرزمین کے خواب ہوتے ہیں وہ دیکھتا ہے کہ اس کے تصور کے اُفق پر سورج کے ابھرنے کا منظر سجا ہوا ہے جیسے کسی دستِ نمیں میں ساغر بلوریں چھلک رہا ہو۔ ہر طرف سبزہ رقص کناں ہوتا ہے اور جوئے رواں کے زمزمے بکھرنے لگتے ہیں ۔ جیسے وادیٔ گل میں خنک ناچ کی سرمستی چھائی ہو لیکن اس خواب کی سرزمین میں وہ زیادہ دیر نہیں رہ سکتا اور زندگی کی حقیقتیں اسے اپنی دنیا میں واپس لے آتی ہیں۔ جہاں اپنے مسائل ہیں۔ لیکن ابھی اس خواب کا اثر اس کے خیال میں باقی رہتا ہے وہ دھوپ میں دہقان کے چہرے پر پسینے کی چمک دیکھتا ہے جو محنت کے صدف میں موتی کی آب و تاب دکھاتا ہے۔ لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں سنہری بالیاں دلکش نظر آتی ہیں اور وہ اس کے خواب کو حقیقت بنتے دیکھتا ہے۔

اگرچہ ملک شاہ سوار علی ناصر کی طبع رسا جو حوالے چاہتی ہے داستانوں سے چن لیتی ہے لیکن اسے اپنے گردوپیش کا جائزہ لینے اور اپنے مشاہدے کے زور پر کہانی کہنے میں زیادہ معنویت نظر آتی ہے۔ اس کے لئے انسان کا ہر خواب وادیٔ الماس کی طرح خوبصورت اور سحر آگیں بن جاتا ہے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ یہ خواب اس وقت تک حقیقت نہیں بن سکتا جب تک سندباد کا حوصلہ نہ حاصل ہو جائے۔ مگر خواب آخر خواب ہوتا ہے۔ لیکن وہ سندباد کے سفر میں امیدوں کے چراغ روشن کرتا ہے اور تجربوں کی روشنی میں وادیٔ الماس کا سراغ پا لیتا ہے۔ جب مایوسیوں کے اندھیرے گھرے ہونے لگتے ہیں تو اس کے لئے کوئی داستانی کردار اس طرح روشنی کی کرن بن کر ابھرتا ہے جیسے کسی طوفان میں گھرے ہوئے ملاح کو اندھیری رات میں منارۂ نور نظر آ جائے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ شامِ درد کے سائے طویل ہونے لگے ہیں تو آج بوالحسن ہی بن جانا چاہئے اور

مضافاتِ شہرِ دل میں ہی چکر لگائیں اور افق کی سمت نگاہیں جما کر راستہ دیکھیں ......کوئی غریب شہرِ ہوس یا غمِ الفت کا تاجر کسی نہ کسی روپ میں، کوئی مشکل کشا ضرور ملے گا، کبھی تو کوئی اجنبی مہمان ایک رات کے لئے ہمارے غم کدے میں بھی قیام کرے گا......کون جانتا ہے کہ مسافر کے بھیس میں اپنی آرشوؤں کا خلیفۂ بغداد مل ہی جائے لیکن جب وہ امید کی کرن دھوکا نظر آنے لگتی ہے اس کا ذہن جس کیفیت میں ہوتا ہے اس کے لئے اسے تمثیل اور علامت بھی ویسی ہی مل جاتی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ آنے والا تاجر ہوگا یا اس کے بھیس میں خلیفۂ بغداد......اور وہ بوالحسن کی طرح مذبذب رہ جاتا ہے۔

وہ داستان کو داستان کی سمجھتا ہے...... زندگی کی حقیقت نہیں ...... اسے معلوم ہے کہ زندگی اور داستان میں سحر و کرامت کا فرق ہے......زندگی مین اسمِ اعظم نہیں ہوتا لیکن اس عالم میں بھی امید کی کرن کبھی کبھی اسے راستہ دکھاتی ہے شاید اس راہ میں استقامت سے گامزن رہا تو منزل کا پالے گا۔ زندگی فریب در فریب راہوں سے گزرتی ہے......اس کے سامنے دُنیا کبھی حسن آرا بن کر آتی ہے اور اپنے حاتم سے ساتھ سوال کرتی ہے اور مہم جوئی کی ہوس اسے کوہِ ندا کے قرب وجوار میں لے آتی ہے جہاں ''یا اخی یا اخی'' کی صدائیں گونجتی ہیں ......راہ میں حمام باد گرد دشتِ عقرب اور قلزم خوں کی منزلیں آتی ہیں جس کی علامتیں منیر شامی، اندھا کنواں، خوبرو شہزادے اور پری چہرہ شہزادیاں، کہیں پتھر اور کہیں مکھی بنے نظر آتے ہیں۔

آج کی ہولناک دُنیا کے سوالوں کو حل کرنا محض ایک حاتم کے بس کی بات نہیں لیکن زندگی کو ایک نئے دور کے حاتم کی تلاش ضرور ہے۔ ویسے اگر غور سے دیکھا جائے تو زندگی کی ہر دشوار گزار راہ میں کوئی حاتم بھی ضرور سرگرمِ سفر ہے......پھر بھی اس دور کا انسان جانتا ہے کہ وہ ہر لمحہ ہلاکت کی امکانات اور خدشات میں زندہ ہے۔ ذہن رسا متحیر ہے......آگہی مہر بلب ہے...... کوئی نہیں جانتا کہ آج کوہِ ندا کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے یا طلسم و افسانہ ہے......لیکن ''یا اخی'' کی صدا سن کر حاتم کی طرف چل پڑتا ہے......کون جانتا ہے کہ جانے والے خردمند ہیں یا دیوانے ہیں یا

انسان کے دل میں کس آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں؟......لیکن اتنا معلوم ہے کہ نادیدہ چٹانوں تک کوئی قدم نہیں پہنچ سکا...... یہ چٹانیں منتظر ہیں اور بلندی سے صدائیں آرہی ہیں ......ایسے میں کوئی شہزادہ، کوئی حاتم آئے گا مگر کب؟؟ دنیا سے موت کے بادل کب چھٹیں گے یہ کسی کو خبر نہیں ......پھر بھی ایک امیدِ موہوم باقی ہے......

وہ جوانِ یمنی شہر میں کب آئے گا
جس کی ہمت کے لئے کوہ ندا کچھ بھی نہیں

ان کہانیوں ملک شاہ سوار علی ناصر نے سخن کا پردہ نہیں بنایا بلکہ ان کے ذریعے ناگفتنی کو گفتنی کا رنگ دیا ہے۔ اس نے اپنی کہانیوں کے تمام کردار اپنے گردوپیش اور قرب و جوار سے منتخب کئے ہیں ......مالک شاہ سوار علی ناصر نے اپنی ماں بولی (پنجابی) میں سے اور ٹھیٹھ دیہی روایت سے اپنی کہانی کا خمیر اٹھایا ہے...... اس کے موضوعات میں روایت کے ساتھ ساتھ فنی پختگی بھی اپنے جوبن پر ہے۔ کہانی کہنے کا سلیقہ اور رکھ رکھاؤ بھی اس کے فن کی پہچان ہے۔ اس نے کہانی پن کو کہیں بوجھل نہیں ہونے دیا۔ تنہائی جوہر بیدار ذہن رکھنے والے انسان کا مقدر ہے اس سے ملک شاہ سوار علی ناصر کو بھی مفر نہیں ہے۔ یہ وجود کا ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی حل دریافت نہیں کیا گیا......تنہائی کی انتہا یہ ہے کہ اس میں خود انسان گم ہو جائے......اسے بھی ایسی ہی تنہائی سے واسطہ پڑا ہے۔ بیٹھکوں، داروں، چوپالوں اور دوستوں کی بھیڑ میں گم رہنے والا ہمارا یہ دوست برسرِ محفل گمشدگی کے دوران ہی اپنی کہانیوں کے تانے بانے بنتا رہتا ہے۔

''تے وت''......ملک شاہ سوار علی ناصر کے مشاہدے اور زندہ احساسات کا ایسا مرقع ہے جس میں بصارت سے زیادہ بصیرت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ ذاتی تجربات کو بھی اجتماعی تجربات سے ہم آہنگ کرنے کے فن سے بھی آگاہ ہے۔ وہ اپنی ذات کو کائنات سے الگ نہیں کرتا بلکہ بے شمار مواقع پر اس کے داخلی معاملات بھی خارجی کیفیات کا روپ دھار لیتے ہیں ......اور یہی وہ مقام ہے جہاں اس کی کہانی از خود بولنے لگتی ہے۔

پروفیسر بشیر احمد سوزؔ......ایک محبِ وطن قلمکار

(ہزارہ میں اردو زبان و ادب کی تاریخ......ایک تاثر)

....

تاریخ نگاری کو حرف آشناؤں نے صرف لفظی حرف بازی اور حرف گیری کا کھیل جان لیا ہے جب کہ یہ کام تو Miniatures پہ نقاشی کے فن جیسا ریاض اور یکسوئی مانگتا ہے۔ Miniature پر کام کرنے والے کو نہ تو کینوس کی وسعت دستیاب ہوتی ہے اور نہ ہی اسے ایزل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بدن کی کسالت اور کساوٹ ایک ٹانگ سے دوسری پر منتقل کرنے کی سہولت میسر ہوتی ہے۔ جس طرح یہ فن گردن نہیوڑائے پہروں بیٹھنے، دھیان اور نگاہ کو ایک نکتے پہ مرتکز رکھنے کے علاوہ موٗقلم پر قدرت کی عطا کا متقاضی ہوتا ہے اسی طرح نقد و نظر کی اقلیم میں صرف مشاہدے، تخیل اور محدود مطالعے کے زور پر زیادہ عرصہ مقیم نہیں رہا جا سکتا کیونکہ متنوع اور مسلسل مطالعے کی عادت اور مطالعہ شدہ مواد کو لاشعور کا حصہ بنائے چلے جانے کی قدرت بھی یہاں لازم ٹھہرتی ہے۔

پروفیسر بشیر احمد سوز کا شمار ان چند گنی چنی تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے ایک سے زائد اصناف کو اپنے فکری اظہار کا کامیاب ذریعہ بنایا ہے۔ پروفیسر بشیر احمد سوز کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ اس سے پہلے ہزارہ شعراء کی نظر میں، اقبال اور ہزارہ، چلکاں (ہزارہ کی منظوم تاریخ)، ہزارہ کی لوک کہانیاں، ہزارہ میں نعت، ہزارہ میں قومی و ملی شاعری، ہزارہ میں ہندکو ادب کی تاریخ (دو جلدیں)، مٹی کی خوشبو، قتیل نام ہے اک عہد کے ترنم کا اور ہندکو کلام پر مشتمل کتاب سوچ منارے جیسی اہم کتب تخلیق و تالیف کر چکے ہیں۔ ایک زمانہ ان کی فسوں کاری، حسنِ اسلوب اور سرزمینِ ہزارہ سے والہانہ محبت کا معترف ہے اور یہ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ اب بھی دائیں اور بائیں سے راستہ بنا کر ہجوم سے آگے نکل جانے کی سعی میں مصروفِ عمل ہیں۔ پروفیسر بشیر احمد سوز ٹوٹ کر محبت کرنے والی شخصیت ہیں اور اس معاملے

میں خوش قسمت بھی کہ انہیں محبت کا جواب ہمیشہ محبت سے ملتا ہے۔ چنانچہ اہلِ علم نے ان کے علمی و ادبی کارناموں کو اعتبار بھی بخشا ہے۔ وہ ایک سنجیدہ، متحرک اور باصلاحیت قلم کار ہیں اور ان کی ایک بہت اچھی عادت یہ بھی ہے کہ وہ مل کر کھیلنے کے عادی ہیں اور دوستوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ادباء و شعراء جو کسی ذہنی مشقت اور تخلیقی تجربے کے بغیر محض وقتی بیسا کھیوں کے بل بوتے پر راتوں رات شہرت کی بلندیوں پہ جا پہنچتے ہیں وہ تھوڑی دیر آسمانِ ادب پہ ٹمٹما کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گمنامی کے غار میں اتر جاتے ہیں۔ اس کے برعکس پروفیسر بشیر احمد سوز کی فکری و فنی تربیت ماہ و سال اور موسموں کی رہینِ منت ہے اور ان کا ادبی ارتقاء رفتہ رفتہ بامِ عروج کی منزل تک پہنچا ہے۔ ''ہزارہ میں اردو زبان و ادب کی تاریخ'' پروفیسر بشیر احمد سوز کے تازہ ترین کارناموں میں سے ایک نمایاں کارنامہ ہے۔ جس میں سرزمین ہزارہ کے تقریباً ہر اس شخص کا تذکرہ موجود ہے جس کا قلم و قرطاس سے کسی بھی ناطے سے واسطہ رہا ہے یا ہے۔

ادب کو مختلف شعبہ ہائے حیات اور جغرافیائی حد بندیوں کے حوالے سے تقسیم کرنے کی روایت خاصی پرانی ہے۔ شہروں اور جغرافیائی تقسیم کے حوالے سے وقتاً فوقتاً کتب اور تذکرے طبع ہوتے رہتے ہیں۔ ادب میں اس روش کی ایک خاص وجہ نظر آتی ہے لیکن سب سے بڑا اور بنیادی مسئلہ پہچان، تفاخر اور الگ شناخت کا ہے۔ اس نوع کی کتابوں کا ایک سبب اور بھی ہے وہ یہ کہ اردو ادب میں جن لوگوں کو زیادہ نمایاں مقام نہیں دیا گیا یا بوجوہ نظر انداز کر دیا گیا ہو انہیں اُجاگر کیا جائے تاکہ تاریخ میں محفوظ ہو جائے ...... یہ ایک مجموعی تاثر کی بات ہے ......ورنہ مضافات کی اصطلاح وضع نہ ہوتی۔

میں نے یہاں مضافات کی اصطلاح دانستہ طور پر استعمال کی ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے میں عرض کروں گا کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح ادب میں بھی قبضہ گروپ معرضِ وجود میں آ چکے ہیں جو اپنے عہد کے بڑے بڑے نابغوں کو مضافاتی

ادیب کہہ کر کھڈے لائن لگائے رکھتے ہیں ...... بلکہ گزشتہ ساٹھ برسوں سے اس قسم کے لوگ ہی پاکستانی ادب کو سبوتاژ کرنے میں لگے رہے۔ اس پس منظر میں پروفیسر بشیر احمد سوز صاحب نے یہ کتاب شائع کر کے ایک طرف جہاد جیسی روایت کو برقرار رکھا ہے تو دوسری طرف قبضہ مافیا کو یہ بھی باور کرا دیا ہے کہ ''انگلی کے پیچھے سورج نہیں چھپایا جا سکتا''۔

''ہزارہ میں اردو زبان وادب کی تاریخ'' کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ شعر وادب کی اس شیرازہ بندی کے پس منظر میں ایک غالب عنصر اپنی سرزمین سے مؤلف کی لازوال محبت کی لاشعوریت کا بھی ہے اور پروفیسر بشیر احمد سوز صاحب نے خسروانِ شعر وادب کو درجہ بدرجہ ایستادہ کر کے اُن کی عظمت اور شعر وادب سے وابستگی کو اس طور اُجاگر کیا ہے کہ کتاب کے لفظ لفظ سے اپنی سرزمین سے ان کی والہانہ عقیدت کا اظہار جھلکتا ہے۔

ہم سبھی جانتے ہیں کہ پروفیسر بشیر احمد سوز کے فرائضِ منصبی اور نظام الاوقات میں ''خواب'' کی گنجائش نہ تھی کتاب لکھنا تو گویا ''کوہ قاف'' میں جانا تھا ...... اس پر معلومات کا ذرہ ذرہ یکجا کر کے ''تحقیق وتذکرہ'' کا ایک پرشکوہ محل تعمیر کر دینا ...... واقعی ایک کرشمہ ہے۔ انہوں نے بے شمار ادباء وشعراء، مؤرخ، محقق، ناول نگار، افسانہ وڈرامہ نویس، خاکہ وسوانح نگار، انشائیہ ومزاح نگار، سفرنامہ نگار، علمائے کرام، مشائخ عظام، صحافی، مترجم اور دیگر شعبہ ہائے علم وادب سے وابستہ شخصیات کے کام کا تفصیلی جائزہ پیش کر کے علمی وادبی لحاظ سے اس زرخیز ترین خطہ کے درخشندہ ستاروں کی ضیاء کو علمی دُنیا میں اِس طرح پہنچایا ہے کہ ان کی سلیقہ مندی اور جانکاہی پر رشک آتا ہے۔

شعر وادب سے وابستہ افراد کے پاس ایک منظم زندگی کا لائحہ عمل ہوتا ہے جس پر کاربند رہ کر ہی وہ علم وادب کی شمعیں روشن کرتے ہیں۔ یہ کتاب پڑھ کر اس لحاظ سے بھی خوشی ہوئی کہ اس میں شعراء اور ادباء کا کلام وبیان بھی منظم نظر آتا ہے۔ نثری شاعری کے نمونے اس کتاب میں کم کم نظر آئے مگر جو ہیں ان میں اظہار کی گرمی اور جذبات کی فراوانی ضرور نظر آتی ہے۔ بشیر احمد سوز

صاحب کی یہ کتاب تعارفی ہی نہیں بلکہ معلوماتی بھی ہے۔ خاص طور پر شعرائے کرام کے مختصر تعارف نہایت جامعیت کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور مستقبل میں اردو ادب کے محققین کے لئے ایک مضبوط اور بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال ہوگی۔ پروفیسر بشیر احمد سوز نے کتاب کے آخر میں انتھک محنت اور جان سوزی کے ساتھ ان تمام کتب کے تفصیلی حوالہ جات بھی درج کئے ہیں جو" ہزارہ میں اردو زبان وادب کی تاریخ " کی تحقیق وتحریر کے دوران اُن کے زیرِ مطالعہ رہیں۔ یہ فہرست بھی محققین اور طلباء کو مزید تفصیلی مطالعے میں یقیناً معاون ثابت ہوگی۔

اتنے ضخیم اور تفصیلی جائزے میں چند ایک اغلاط یا تاریخی لحاظ سے کچھ کمزور شواہد اور شہادتوں کا درآنا ایک فطری امر ہوتا ہے جس کا اہم محرک بنیادی حوالہ جات کی عدم دستیابی اور بعض اہلِ علم کی طرف سے معلومات کی بروقت فراہمی میں عدم تعاون بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ موضوع کی وسعت، وسائل کی کمیابی، کتاب کی طباعت اور پھر کتاب کی فروخت ...... مسائل در مسائل کی ایک لمبی قطار ہے جس کے سامنے پروفیسر بشیر احمد سوز سینہ تان کر کھڑے رہے۔ یہ بار تو اُردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے نام پر بھاری تنخواہیں اور سرکاری مناصب کی جملہ مراعات ڈکارنے والوں یا اس مقصد کے لئے بنائے جانے والے سرکاری اداروں کا تھا جسے ایک ریٹائرڈ معلم نے اٹھایا۔

کام کوئی بھی ہو اسے کرنے کا طریقہ درست اور دلچسپی کا حامل ہو تو نتائج ہمیشہ مثبت اور بارآور ہوا کرتے ہیں۔ تاریخ کے معاملے میں قطرہ قطرہ سمیٹ کر سمندر بنانا پڑتا ہے اور پھر اس قلزم کو عبور کرنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد پروفیسر بشیر احمد سوز اپنے وسیع مطالعے، عمیق مشاہدے اور طویل فنی ریاضت کی بدولت اہلِ قلم کے اس قبیلے کے سرخیل بن چکے ہیں جو کٹھن ذہنی ریاضت اور مشقت کے بعد اہلِ ہزارہ کے ماضی وحال کی درخشاں علمی وادبی میراث کو ازسرِ نو مرتب کرنے میں دل وجان سے کوشاں ہیں۔

بشیر احمد سوز صاحب جہاں یہ کتاب لکھ کر اہلِ ہزارہ کے قد وقامت میں اضافے کا

باعث بنے ہیں وہاں انہوں نے بزعم خود بڑے بڑے جغادریوں کو ایک عجیب مخمصے میں ڈال دیا ہے کہ وہ سوزؔ صاحب کی کارکردگی کا اعتراف کرتے ہیں تو بونے کہلاتے ہیں......اور نہیں کرتے تو حاسدوں میں شمار ہوتے ہیں۔

''ہزارہ میں اردو زبان و ادب کی تاریخ'' لکھ کر پروفیسر بشیر احمد سوزؔ صاحب نے سرزمینِ ہزارہ سے اپنی لازوال محبت کا قرض اُتار دیا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو ادب بالخصوص سرزمینِ ہزارہ کا قاری انہیں کیا صلہ دیتا ہے اور ہزارہ کے ذمہ دار عمائدین کے پاس اُن کے لئے کون سا نشانِ اعزاز ہے۔

آخر میں، میں اس کتاب کی اشاعت پر پروفیسر بشیر احمد سوز صاحب کو اپنے دِل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور مجلسِ قائمہ قلم کاروان حویلیاں کا مشکور ہوں کہ جس نے مجھے اس پلیٹ فارم سے کچھ کہنے کے قابل سمجھا۔

آتش زیرِ پا رکھنے والا تخلیق کار

جاوید شاہین کا ایک مقطع ہے:

بات جو دل میں ہے کھل کر اُسے کہہ دے شاہیںؔ
کیا خبر کل کو یہ آشفتہ بیانی نہ رہے

''مجھے روشنی چاہیئے''......ساجد خان کے پچیس افسانوں اور کہانیوں پر مشتمل اس کا اوّلین مجموعہ ہے۔ ساجد خان ہمارے عہد کا ایک ایسا افسانہ نگار ہے جو روایت شکن بھی اور روایت ساز بھی۔ وہ اظہار اور موضوعات کی ترسیل کے معاملے میں ''گائیڈ ڈ میزائل'' کا ہمسفر نہیں۔ اس کا فکری بہاؤ اور جذباتی تحرک متعین منزل پر پہنچنے کے بجائے تخیل اور تجربے کے کھلے میدانوں میں صحرائی ریت کی مانند شش جہت میں پھیلتا نظر آتا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ اس کا اپنا کوئی ویژن نہیں......وہ ہر شے، واقعے، تجربے، واردات اور معاملے کی تہوں میں اتر کر حقائق اور اصلیتوں سے ایسی صورتیں اجاگر کرتا ہے جنہیں دیکھ کر قاری نتائج اور مقاصد تک از خود پہنچنے کی سبیل ڈھونڈ لیتا ہے۔

ولیم جیمز کہتا ہے کہ ''تجربہ کبھی محدود نہیں ہوتا کیونکہ یہ کبھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ یہ ایک وسیع صلاحیت کا احساس ہے......مکڑی کا بہت بڑا جالا ہے......جس کا تانا بانا نہایت مہین اور ریشمی دھاگوں سے بنا ہے۔ یہ جالا انسانی شعور کے کمرے میں پھیلا ہے۔ اس کی گرفت میں چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ آجاتا ہے۔ اسے شعور کی فضائے محیط کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اگر شعور زبردست قوتِ تخیل کا مالک ہے یا کسی نابغے (جینئس) کا شعور ہے تو کوئی شے اس کے دائرے سے خارج نہیں رہتی''۔

ساجد خان کے تجربے کو اسی حوالے سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس کا شعور ٹکڑوں میں بٹا ہوا نہیں بلکہ ایک تجرباتی کل سے متعلق ہے۔ اس کے شعور کی فضائے محیط نے ان افسانوں کو مخصوص لب ولہجہ عطا کیا ہے۔ اس کے افسانوں میں تجربے محض تجربے نہیں رہتے کہ وہ اپنے

وجودی نکھار سے بے نیاز ہو جائیں اور اپنے جذبوں بھرے شعوری رویوں کا اظہار بھی نہ کر سکیں۔اس کے تجربے اس کی عملی زندگی کے خمیر سے تیار ہوئے ہیں۔

ساجد خان کا فن نہ تو جذبات وافکار کی پیچیدہ اکائیوں سے مرتب ہونے والا کوئی حل شدہ ریاضیاتی فارمولا ہے، نہ ہی کوئی امتحان پاس کرنے کے لئے گٹ تھرو گائیڈ اور نہ ہی اس کا تعلق کسی دائیں بائیں کی منشوریاتی راہ عمل سے ہے۔ساجد خان اپنے بہت سے ہم عصر افسانہ نویسوں کی مانند سستی جذباتیت ،نرم وملائم اظہاریت ،جنسی نشاطیت اور جسمانی مقناطیسیت کے حربوں سے کام لینے کومعیوب جانتا ہےاور سستی شہرت حاصل کر کے ٹیبل ٹاک بننا اس کا مسئلہ ہرگز نہیں۔اس کے برعکس وہ اپنے گردوپیش کے حالات کی عذاب آفرینیوں میں فرد کی بے حسی اور اپنے خول میں سمٹ جانے کے عمل پر احتجاج کرتا ہے۔وہ کچلی روحوں اور بے بس نسلوں کو زندگی کے حقیقی معانی جاننے کی اہمیت پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔

ساجد خان کارزارِ حیات میں دوستی اور دشمنی کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہےاور سماج میں زندگی کی میکانکیت اور یکسانیت سے نالاں بھی ہے۔جذبوں کی نارسائی کا اُسے شدید قلق ہے۔ اسے یہ جذبے آنکھ کنارے ٹوٹی پتنگ کی مانند نظر آتے ہیں۔آس اور اُمید دلاتے لمحے اسے پریشان کرتے ہیں۔تجارتی رشتوں کے سماج میں اُسے اپنا وجود اُس بوسیدہ کپڑے کی صورت نظر آتا ہے جسے نہ پہنا جا سکتا ہےاور نہ ہی سنبھال کر رکھا جا سکتا ہے۔اس کے شہرِ محبت میں ایسے کوڑھ زدہ وجودوں کی بہتات ہے جن کا علاج محبت کی بارش کے سوا کچھ نہیں۔ بے یقینی اور نا اُمیدی کی تاریک دلدلوں میں ڈوبتے ضمیر ساجد خان کو ہانٹ کرتے ہیں اور وہ چیخ اٹھتا ہے۔اسے بولتی زبانوں پر سنہری تالے نظر آتے ہیں اور اُسے ہر سماجی قدر میں سرمائے کی سکاچ ٹیپ کا عمل دخل نظر آتا ہے۔وہ ''حقِ ملکیت'' جتانے کے خلاف ہے...... ہر نوع کی حقِ ملکیت کے خلاف......وہ دولت ،محبت اور عقیدت کی مساویانہ تقسیم کا علمبردار ہےاور محبت میں بغاوت اور احتجاج کو اپنا بنیادی حق سمجھتا ہے۔

آزادی ساجد خان کے وجود کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اس کا کہنا ہے کہ آزادی سرمائے سے سلب ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے انسانوں کی خرید وفروخت ہوتی ہے لیکن اس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے اس لئے وہ آزاد ہے۔ جب وہ اپنے گردوپیش میں معصوم انسانیت کی پناہ گاہوں کی کے بجائے جبری مشقت اور چائلڈ لیبر کے ایسے اڈے موجود پاتا ہے جہاں معصوم بچوں سے ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کی قربانی لے کر جانوروں کی طرح دن رات مشقت کرائی جاتی ہے تو اسے سماج کے ایسے طبقات سے نفرت ہونے لگتی ہے جو ان ننھے فرشتوں کی تکالیف کا باعث ہیں......ایسے ماحول میں اس کا جی متلانے لگتا ہے۔

ساجد خان کی کہانیوں اور افسانوں میں وجودی رشتوں کی بھرپور شکلیں اجاگر ہوئی ہیں۔ ابلاغ، آزادی، وابستگی، موت اور زندگی کی جدلیات، بے معنویت، ذہنوں کا بنجر پن، احتجاج، مزاحمت، محبت، وجود اور سیاست، وجود اور معاشرت، وجود اور وجود کی آویزش، اداسیاں، بے ہنگم کام، بے آس تنہائیاں، انسان اور انسانی رشتوں کے مابین فاصلے، بھوک، ناداری، غربت، جرم وسزا، عدم وصال، روحوں کا نیلام، اجنبیت، جلاوطنی اور اس کا عذاب، افیونی قدریں، سردمہریاں، سجے اور آراستہ وجودوں کی طراریاں اور بربادیاں، خودشناسی، خواب اور حقیقت کا اِتصال، ڈر، دہشت گردی، لاشیں اور انسانی آرزوؤں کی تاراجی اور اس قسم کے دیگر لاتعداد تاثرات، تلازمات اور موضوعات اس کے افسانوں کی بنت میں شامل ہیں۔

ساجد خان چونکہ افسانہ نویس ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہے اس لئے اس تحریروں میں "قلم کارواں حویلیاں" کے شعراء کی دوستی اور ان کے ساتھ نشست وبرخاست کے اثرات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں......جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اس کی کہانیوں کے پس منظر میں ن م راشد کی سی روایت شکنی بھی ہے اور افتخار جالب کی لسانی توڑ پھوڑ بھی......میراجی کا سادہ اور اتھاہ گہرائیوں سے معمور اسلوب بھی ہے اور مجید امجد کی جزئیات نگاری بھی......لیکن اس سب کے باوجود اس نے اپنا ایک منفرد رنگ بھی جمانے کی کوشش کی ہے۔ سیدھے سپاٹ لہجے میں بات کر

جانے کی تکنیک میں اس کی ذات اور شعور کا بھرپور اظہار اس کی مہارتوں کا نقیب ہے۔

جدید فلسفیوں اور خاص طور پر وجودیت اور تصوف کے مطالعے نے ساجد خان کے شعور کو نئی جہتیں عطا کی ہیں اور اسے اپنے جذبے اور شعور سے مکمل طور پر آگاہی ہے......اس کے افسانوں اور کہانیوں کا نفسیاتی اور حسی تجزیہ کرتے ہوئے اس کے اسلوب کی برجستگی اور بے تکلفی کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ اس کی توجہ نہ تو صناعی کی جانب ہے اور نہ ہی اسلوب کے بناؤ سنوار کی جانب......لفظوں کی نشست و برخاست کا ریاضت طلب معاملہ اس کے لئے اہم نہیں......وہ خیال اور جذبے کے بہاؤ میں بہتا ہے اور ہر نوع کے الفاظ میں اپنے مفاہیم کو منتقل کرتا چلا جاتا ہے۔ ہندکو، انگریزی، پنجابی اور دیگر زبانوں کے الفاظ اردو اسلوب اور روائتی آہنگ میں استعمال کرنا اس کے لئے ممنوعہ نہیں ہے۔

ساجد خان متوسط طبقے کا پڑھا لکھا باشعور نوجوان ہے۔ وہ نئی نسل کا بظاہر دھیما لہجہ رکھنے والا آتش زیر پا تخلیق کار ہے۔ اس زیر پا آتش کا مرکز اس کا تندور کی مانند دہکتا قلب ہے۔ اس آگ کو ہوا دینے کا کام اس کے دماغ کے ذمے ہے۔ ساجد خان کی کہانیاں ایسی خود کلامی ہیں جس میں ہمکلامی اور خارجی آوازیں بھی شامل ہیں۔ اس کے لفظوں میں اس کے احتجاجی لہو کا پارا بھرا ہوا ہے اور اس کے افسانوں میں جبر کی بستیوں کو خاکستر کر دینے والا لاوا بھی ہے۔ اس کے متخیلہ کے جال میں وہ سب گندی مچھلیاں گرفتار ہوئی ہیں جنہوں نے زندگی کے شفاف اور خوبصورت تالاب کو خراب کر رکھا ہے۔

ساجد خان کے افسانے اس کے سچے اور حقیقی تجربوں سے کشید ہوئے ہیں۔ اس کی کہانیاں اور افسانے نہ تو لذتِ وصال سے بھرپور ہیں اور نہ ہی کربِ ہجر کی لایعنی داستانیں...... اور اس کے افسانوں میں سماجی سمجھوتہ بازی اور کچی رومانویت کے عناصر بھی دستیاب نہیں ہیں۔ وہ جس قسم کے ماحول میں رہا، جیسی اس کو دوستوں کی محفلیں میسر آئیں، گردوپیش میں جس صورت حال سے واسطہ پڑا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے شعور کی باطنی آنکھ نے اس کے گردوپیش کے

تجربوں کو جس کینوس پر ترتیب دیا اس کی کتاب اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ساجد خان نے زندگی کے تجربات کو جس خلوص اور دیانت کے ساتھ اپنے افسانوں اور کہانیوں میں سمیٹا ہے یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد مجھے یہ پیشنگوئی کرنے میں کوئی باق نہیں کہ مستقبل قریب میں اسے اپنے فکری وفنی اسلوب، اظہار اور ڈکشن کی وجہ سے ایک منفرد اور واضح شناخت بنانے میں کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

''کھیڈ ان''......بارش کی پہلی بوند

انسان میں کہانی سننے کا شوق فطری ہے۔اس کی وجہ ظاہر ہے......کہانی میں کتنے ہی مافوق الفطرت عناصر موجود کیوں نہ ہوں، آپ اس میں کتنا ہی خوفناک جن کیوں نہ داخل کر دیں اور کتنی ہی پریوں کو محوِ پرواز کیوں نہ دکھا دیں، کہانی کا آخری تجزیہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس کا تعلق انسان کی ذات اور اس کی کیفیات سے ہے۔ ظاہر ہے شروع شروع میں انسان نے جو کہانیاں کہی ہوں گی وہ بہت سادہ ہوں گی۔۔ جوں جوں وقت گزرتا چلا گیا انسان کے شعورِ ذات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ انسانی روابط پیچیدہ تر ہوتے چلے گئے۔ اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی نظام مختلف منزلوں سے گزر کر کہیں سے کہیں پہنچے، توں توں کہانیاں اور داستانیں بھی شائستہ، مہذب اور پیچ دار ہونے لگیں۔ داستانوں میں دلچسپی کے جو عناصر تھے وہ فن کار نے لے لئے اور پھر زمانے کے تغیرات اور انقلابات کے ساتھ ساتھ اس کے شعورِ تخلیق نے بھی نمو پانا شروع کیا۔

کہانی کہنے اور سنانے کے مختلف طریقے رائج ہیں......داستان، ناول، افسانہ، تھیٹر، فلم اور ڈرامہ وغیرہ۔ داستان اور ڈرامہ نویسی کی تاریخ بہت قدیم اور پیچ دار ہے......ڈراما، تمثیل یا کھیل اصلاً سٹیج پر کھیلے جاتے ہیں۔ڈرامے میں پلاٹ، بنت اور ماجرا طرازی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔کہانی میں اتار چڑھاؤ، واقعات کا نشیب و فراز، کرداروں کی تشخیص، مکالمے یا گفتگو کی معنی خیزی اس کے بنیادی لوازمات ہیں۔ ڈراما زندگی کے کسی عہد یا کسی عہد کے ایک پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ڈرامے اور ناول میں کئی لحاظ سے گہری مماثلت ہونے کے باوجود اس کی ہیت، تکنیک، تشکیل، تعمیر اور ترتیب میں بعض معاملات میں بنیادی فرق بھی ہے۔ ناول نگار اپنی تخلیق کے تمام اجزاء پر قدرتِ کاملہ رکھتا ہے۔ وہ کرداروں سے، مکالمے سے، وصف سے، بیان سے، شخصی تنقید سے جو کام چاہے لے سکتا ہے۔ جہاں دیکھا کہ مکالمے میں جھول پڑ گیا ہے بیان

سے بات بنا دی...... جہاں بیان کو ناقص دیکھا، مکالموں کی چستی اور چالاکی سے کہانی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا...... اس کے برخلاف ڈراما ایک خود مکتفی ادبی تخلیق نہیں ہوتی ...... اس کا ہر جزو مصنف کے سوا دوسرے اشخاص کی سوجھ بوجھ، تعاون اور بصیرت کا محتاج ہے۔

ڈرامے یا تمثیل کا اصل منصب یہ ہے کہ وہ فریب نظر پیدا کرے۔ سننے اور دیکھنے والوں کو ایک محدود وقت میں یہ بات باور کرنے پر مجبور کر دے کہ زندگی کا ایک ٹکڑا ان کے سامنے رقصاں ہو گیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ڈرامہ نگار محض اپنی فن کاری، بصیرت اور ادبی سوجھ بوجھ پر بھروسا نہیں کرسکتا۔ اسے جبراً وقہراً دوسروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ ڈراما معاشرت کی تصویر کھینچنے کی کوشش میں جو فریب نظر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کا انحصار اداکار یا صداکار کی جیتی جاگتی شخصیت پر ہوتا ہے۔ اگر اداکار اپنے اوپر وہ زندگی طاری کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جو مطلوب ہے تو وہ فریب نظر کی تکمیل میں معاون ہوگا اور اگر وہ خود ہی غیر مطمئن ہے تو تمثیل کا سماں کبھی نہ بندھے گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ ڈرامے کے کردار بھی ہوا میں معلق نہیں ہوتے، وہ کسی عہد، معاشرت یا زمانے سے ضرور مربوط ہوتے ہیں۔ ان کی ذہنی استعداد اور ان کے کوائف کم وبیش اسی عہد، معاشرت یا زمانے سے مربوط ہوتے ہیں۔ زمان ومکان وہ آئینہ ہیں جن میں کردار چلتے پھرتے، ہنستے بولتے اور جیتے مرتے دکھائی دیتے ہیں۔ زمان ومکان ہی کرداروں کو حقیقت اور واقعیت کا رنگ بخشتے ہیں۔ بعض اوقات ڈرامہ نویس بالکل کرداروں کی آڑ میں ہو جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کردار ایک علیحدہ مستقل زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن دراصل ایسا ہوتا نہیں۔ کسی نہ کسی حد تک کرداروں کی زبان سے زمان ومکان کے تقاضوں کے مطابق تخلیق کار کی اخلاقی اقدار مترشح ہوتی رہتی ہیں۔ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جو زمان ومکان سے قطع نظر بنیادی انسانیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ تخلیق کاران مسائل کے متعلق اپنا نقطہ نظر کرداروں ہی کی زبان سے بیان کرسکتا ہے یا پھر ڈرامے کے انجام سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کی ہمدردی کا رخ کس طرف تھا۔

ناسخ اور ڈراما نگار میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔تخلیق کار کہتا ہے کہ زندگی یہ ہے جو میں نے دیکھی ہے اور ناسخ کہتا ہے کہ زندگی کو یوں ہونا چاہئے۔ ڈراما نگار کا اصلی کام معاشرت کی تصویر پیش کرنا ہوتا ہے......جس کی عکاسی کردار اپنے اقوال اور اعمال کے ذریعے کرتے ہیں۔ ڈرامے میں غم دوراں بھی ہوسکتا ہے اور غم جاناں بھی، حسنِ یار بھی اور جمال روزگار بھی ......ڈرامے میں بھرپور اور سرشار زندگی کا ہونا لازمی ہے۔ جو ڈرامہ زندگی کے سرچشموں کے جتنا قریب ہوتا ہے اتنا ہی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔عبدالوحید بسمل نے اپنے ڈراموں کے کردار اور کہانی دونوں حقیقی زندگی اور اپنی تہذیبی معاشرت سے کشید کیے ہیں۔اس کی کہانی نیم خواندہ، دیہی طبقے اور پسماندہ معاشرے کی ناآسودہ خواہشات کے تانے بانے سے نکھر سنور کر ڈرامے کا روپ دھارتی ہے۔ وہ زندگی کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے جو اس کے ڈرامے کا بنیادی وصف ہے۔عبدالوحید بسمل ایک حساس اور دردمند دل رکھنے والا انسان ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنے ڈراموں میں انسان کے روایتی بنیادی مسائل کو موضوع سخن بنایا ہے......اس کے کردار ہمارے گردوپیش کے لوگ ہیں......جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالوحید بسمل کو اپنے گردوپیش کے لوگوں کے بنیادی مسائل کا بخوبی ادراک ہے اور وہ اپنے لوگوں کے اس درد کو اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔

ڈارمے میں مکالمات کی بندش، چستی اور صنعت گری بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ مکالمات کے ذریعے ہی ہم حقیقت کو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی کلیت کا شعور حاصل کرتے ہیں۔ مکالمے کا منصب صرف یہی نہیں کہ کردار نگاری میں مدد دے، کردار کے افکار و تصورات کی توضیح کرے اور کہانی کو آگے بڑھائے بلکہ ڈرامے میں وہ ڈرامائی رنگ بھی پیدا کرے جو ہر اچھے ڈرامے کی بنیادی ضرورت ہوتا ہے۔ چست اور جان دار مکالمے ترشے ہوئے فقرے، صنعت گری کی سان پر چڑھے ہوئے جملے ہمارے اشتیاق کو بڑھائیں اور تمثیل کو وہ رنگ عطا کریں جو کسی بھی ڈرامے کی کامیابی کی ضمانت دیں۔عبدالوحید بسمل کے ڈراموں میں ادبی چاشنی تو ہے ہی لیکن پڑھنے والے کی دلچسپی، محویت اور تجسس کو ابھارنے کا سامان بھی ہے۔ قاری ایک

ڈرامہ پڑھنے کے بعد دوسرے کے بارے میں متجسس نظر آتا ہے۔ ہر ڈرامے کی punching lineاتنی زبردست اور برمحل ہوتی ہے کہ قاری کہانی کے سحر سے تا دیر نکل نہیں پاتا۔

اسی طرح ڈرامے کے بنیادی لوازمات میں نقطہ آغاز یعنی تعارف، تعارف کا اختتام، کشمکش کا ارتقا، منطقی انجام شامل ہوتا ہے۔ منطقی انجام اس اعتبار سے کہ انجام بیشتر کرداروں کی سیرت اور ان کے باہمی ردِ عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ انجام کو تمثیل نگار شعبدہ باز کی طرح جھولی میں سے نکالتا ہے۔ یہی کھیل کی کامیابی کا گر اور یہی اس کی کامیابی کی کسوٹی ہے۔ عبدالوحید بسمل کو زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ ڈرامہ پڑھتے ہوئے دُور دیہات میں بولے جانے روزمرہ محاورے، وہاں کے ماحول اور سادگی وسچائی سے بھرپور برجستہ جملوں کی نشست و برخاست قاری کو اپنے حصار میں جکڑ لیتی ہے..... قاری ..... پھر کیا ہوا؟ آگے کیا ہوگا؟ ...... اسے ایسے ہی ہونا چاہیے! ...... جیسے شعوری سوالات کی بھول بھلیوں میں کھویا رہتا ہے کہ عبدالوحید بسمل اچانک کمال ہنر مندی سے اپنی شعبدہ بازی کی چھاگل سے لفظوں کا ٹھنڈے، میٹھے اور شفاف پانی کے جیسا چھینٹا اس مہارت سے قاری کے منہ پہ مارتا ہے کہ سوالات اور تجسس کی ساری تشنگی ایک بھرپور سیرابی کا روپ دھار لیتی ہے۔

سٹیج ڈراما کے برخلاف ریڈیو ڈرامے کے اپنے فنی اور تکنیکی حدود متعین ہوتے ہیں۔ سٹیج پر اداکار اپنی body language، اور ظاہری تاثرات کے ذریعے ناظرین تک بہت کچھ منتقل کرسکتا ہے جب کہ ریڈیو پر صرف آواز کے اتار چڑھاؤ اور صوتی اثرات کے ذریعے ہی سامع کے دِل تک پہنچنا ہوتا ہے۔ ایک متعین وقت کے اندر رہتے ہوئے اپنی بات کو مکمل کرنا ریڈیو ڈرامے کے لئے ضروری ہوجاتا ہے۔ اس لحاظ سے ریڈیو کے لئے ڈرامہ لکھنے والوں کو زیادہ جان ماری کرنا پڑتی ہے۔ عبدالوحید بسمل نے اپنے ڈراموں میں ریڈیو کی فنی اور تکنیکی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک لفظ بھی کم یا زیادہ نہیں لکھا ...... ہر ایک لفظ، ہر ایک جملہ اور ہر ایک سطر برجستہ و برمحل ہے۔

زبان ایک زندہ حقیقت کا نام ہے اگر اسے خارجی آلودگی سے بچا لیا جائے تو اس میں زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کے امکانات وسیع تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔کوئی بھی زبان ہو وہ اپنے بولنے والوں سے اپنے ہونے کا خراج مانگتی ہے اور جو لوگ اس زبان میں سوچتے، بولتے اور لکھتے ہیں وہی اس زبان کی ترویج وترقی اور پرداخت کا حق ادا کرتے ہیں۔یار لوگ کہہ سکتے ہیں کہ عبدالوحید بسمل نے ریڈیو ڈرامہ لکھ کر کون سا بڑا تیر مارا ہے ......ان سے پہلے بیسیوں معروف ڈرامہ نویس ریڈیو کے لئے سینکڑوں یادگار ڈرامے لکھ چکے ہیں......لیکن جناب! عبدالوحید بسمل کا یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ اس نے اپنی ماں بولی میں ادبی چاشنی سے بھرپور ڈرامے پیش کئے ہیں اور نہ صرف پیش کئے ہیں بلکہ اہلِ ہزارہ کو ہندکو زبان میں ڈراموں کی ایک خوبصورت کتاب بھی دی ہے......میں تو کہوں گا کہ عبدالوحید بسمل نے وہ قلعہ فتح کرلیا ہے جو اس سے پہلے اہلِ ہزارہ کے لئے ناقابلِ تسخیر تھا۔

ہندکو زبان اپنی مٹھاس، شیرینی اور نزاکت کی وجہ سے تمام پاکستانی زبانوں میں ایک منفرد اور اچھوتی تاثیر کی حامل ہے۔اس زبان کے بولنے والوں کا تعلق بفہ گرام سے ہو یا کھلابٹ سے گلیات سے ہو یا شیروان کے کسی دور دراز سرحدی گاؤں سے...... یہ زبان انہیں تسبیح کے دانوں کی طرح ایک مالا میں پروتی ہے۔عبدالوحید بسمل نے اپنی ماں بولی میں ڈرامہ لکھ کر نہ صرف اپنی ماں بولی کا حق ادا کیا ہے بلکہ اہلِ ہزارہ کو اس کی شرینی، حلاوت، لوچ اور آہنگ سے بھی روشناس کرایا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عبدالوحید بسمل نے ان ڈراموں میں روایتی کہانی کا سہارا لیا ہے۔لیکن روایت سے جڑی ہوئی بے شمار خوبصورتیوں اور بدصورتیوں کو اپنے لوگوں تک اس انداز سے پہنچایا کہ وہ ان کے دلوں کی دھڑکن میں شامل ہو جائیں ...... یہ کسی عام فنکار کے بس کی بات نہیں ہوتی۔آسکر وائلڈ کا قول ہے کہ "ڈرامے میں اگر ایک بھی چست فقرہ یا دلچسپ لطیفہ شامل ہو تو یہ کسی کامیاب ڈرامے کی نشانی ہے"۔وحید بسمل کے ڈرامے میں ایسے کامیابی کے بے شمار نمونے مل سکتے ہیں۔

بلا شبہ ہندکو زبان و ادب میں عبدالوحید بسمل کی ''کھیڈاں'' اس سرزمین پر ڈرامہ نویسی میں بارش کی وہ پہلی بوند ہے جس سے اس زبان کی مہک چاروں اور پھیلے گی۔ انشاء اللہ!...... میں اہل ہزارہ کو اور بالخصوص جناب عبدالوحید بسمل کو اس خوبصورت کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آخر میں ہندکو زبان بولنے والے تمام شعراء اور ادیبوں سے مجھے ایک گلہ بھی کرنا ہے......میری معلومات کے مطابق اب تک ہندکو زبان میں تمام علوم اور اصناف ادب میں مطبوعہ نظم و نثر کی چھوٹی بڑی دستیاب کتابوں کی تعداد صرف تین سو اکاون ہے......اتنی قدیم زبان میں صرف تین سو اکاون کتب؟؟...... یہ حیرت انگیز طور پر ان شعراء اور ادیبوں کی اپنی ماں بولی سے عدم توجہ کا واضح ثبوت ہے...... جب آپ صوبہ ہزارہ مانگ رہے ہیں تو آپ کو اس علاقے کی مرکزی زبان میں کتابوں کے ڈھیر لگا دینے چاہئیں......تفسیر، فقہ و حدیث، فلسفہ و حکمت، تحقیق و تنقید، ناول، ڈرامہ، افسانہ اور شعر و ادب کا وسیع میدان آپ کے سامنے ہے......اس میں علم و حکمت کے پھول کھلائیں اور اس میدان میں اس دلجمعی سے اتریں کہ دُنیا کے تمام علوم کی کتب آپ کی اپنی زبان میں دستیاب ہوں ...... یہ کام دشوار سہی لیکن ناممکن بھی نہیں......صرف مستحکم ارادے کی ضرورت ہے۔